سفید خون
اشتیاق احمد

37

محمود، فاروق، فرزانہ اور

انسپکٹر جمشید کے کارنامے ۲۱

سفید خون

اشتیاق احمد

بار اوّل : نومبر ۱۹۸۰ء
تعداد : ۶۰۰۰
مطبع : محبوب پرنٹنگ کارپوریشن لاہور
کتابت: محمد علی اشفاق

مکتبہ اشتیاق
۲، شیخ سٹریٹ ۶۵ اسلام پورہ۔ لاہور

ترتیب

دو باتیں

یہ سفید خون ہے، کیونکہ اگر سرخ خون ہوتا تو آپ کے لیے
حیرت کی کوئی بات نہیں تھی اور جس بات میں کوئی حیرت کی بات نہ ہو،
وہ بات ان ناولوں کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں، آپ کہیں گے،
یہ کیا بات بے بات لے بیٹھے، لیکن میرا دعویٰ ہے، یہ بات بے پر کی
نہیں ہے، بات سے ہی بات نکلتی ہے، یہ تو پھر دو باتیں ہیں، ارے
شاید میں بات کے پیچھے ہاتھ دھو کر ہی پڑ گیا، خیر اب باتیں بند، لیکن سوال
یہ ہے کہ باتیں بند کر دی گئیں تو اس صفحے کا پیٹ کیسے بھرے گا، ظاہر ہے
یہ تو باتیں ہی کھا سکتا ہے، چاہے تُک کی ہوں یا بے تکی، ویسے انصاف
کی بات یہ ہے کہ اس بار "دو باتیں" میں مَیں نے ایک بھی تُک کی بات نہیں
کی، چلیے ایک تُک کی بات بھی ہو جائے، یہ کہ سانامر جیرال کا منصوبہ زیادہ
تر پڑھنے والوں کو پسند آیا۔ ثبوت کے طور پر خطوط کا ایک انبار میرے پاس جمع
ہو چکا ہے، اور ڈاکیا ابھی تک بنڈل پہ بنڈل لا رہا ہے، وہ بیچارہ بھی حیران اور پریشان
ہے۔ لیکن میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ جس بات میں حیرت نہ ہو، وہ ہمارے
ہاں موزوں نہیں، لہٰذا اس بات پر دو باتیں ختم کرتا ہوں۔

اشتیاق احمد

زرد لفافہ

انوار علی خان نے ڈاک میں سے زرد رنگ کا لفافہ اٹھا کر الٹ
پلٹ کر دیکھا، اس پر لفافہ بھیجنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا
انہوں نے لفافہ کھولا، اس میں کاغذ بھی زرد رنگ کا تھا، یہ دیکھ
کر وہ بڑبڑائے:

"شاید اس شخص کو زرد رنگ بہت پسند ہے۔"

کاغذ کھولا تو اس پر مختصر سی تحریر نظر آئی، لکھا تھا:

"میں بہت جلد تمہیں قتل کر دوں گا۔ بچنے
کے لیے کچھ بھی کر لو۔ تمہیں ہرگز زندہ
نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے اپنی زندگی کا
یہی مقصد بنا لیا ہے۔"

تحریر کے نیچے بھی کسی کا نام نہیں تھا۔ انہوں نے حیران ہو کر
تحریر کو کئی مرتبہ پڑھا اور پھر سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ بہت مشہور
جج تھے۔ انہوں نے انصاف کا دامن کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی
عدالت میں بہت بڑے بڑے لوگوں کے مقدمے لگے تھے۔ اکثر

بہت بڑے بڑے لوگوں کی سفارشیں بھی آتی تھیں، لیکن انہوں نے کبھی کسی کی سفارش قبول نہیں کی تھی، ہر مقدمے کا وہی فیصلہ کیا تھا جو ان کے خیال میں درست تھا۔ وہ قتل کے مقدمات کے لیے بہت شہرت رکھتے تھے۔ دوسرے جج ان کا حد درجے احترام کرتے۔ ان کی زندگی میں اس قسم کا یہ پہلا خط تھا۔ انہوں نے خط کو لفافے میں ڈالا اور پھر ایک بڑے لفافے میں یہ لفافہ ڈال کر بند کیا اور گھنٹی بجائی۔ دوسرے ہی لمحے ان کا ملازم اندر داخل ہوا۔

"کیا حکم ہے سرکار۔" وہ انہیں ہمیشہ سرکار کہا کرتا تھا۔

"نصرت خان: یہ لفافہ انسپکٹر نعمانی کو دے آؤ۔"

"جی بہت بہتر۔"

نصرت خان نے ادب سے کہا اور لفافہ لے کر باہر نکل گیا۔

انسپکٹر نعمانی ان کے علاقے کے تھانے کا انچارج تھا اور اکثر ان کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے بھی کسی قتل کے ملزم کے لیے سفارش کی تھی۔ انسپکٹر نعمانی سے ان کا واسطہ عام طور پر پڑتا رہتا تھا۔ وہ اسے پسند بھی کرتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں انسپکٹر نعمانی ایک محنتی اور ایماندار افسر تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس کی سفارش منظور نہیں کی تھی، اور فیصلہ اپنی مرضی سے دیا تھا، اس پر انسپکٹر نعمانی نے ان کی بہت تعریف کی تھی اور بُرا نہیں مانا تھا۔ اس کا آنا جانا بھی

بدستور جاری رہا تھا۔

ڈاک سے فارغ ہو کر انہوں نے کھانا کھایا اور ابھی فارغ ہوئے تھے کہ انسپکٹر نعمانی آ گیا۔

"میں نے اس کی خط کی بنیاد پر رپورٹ درج کر لی ہے، لیکن حیران ہوں کہ وہ کون شخص ہے۔" اس نے آتے ہی کہا۔

"شاید کوئی دیوانہ ہے۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ میں ایسے خطوط کے رعب میں آنے والا نہیں۔ میں جانتا ہوں، میرے مخالف ان گنت لوگ ہیں، یہ ان میں سے ہی کوئی ہو گا۔"

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں، کیا میں خط لکھنے والے کا پتا لگانے کی کوشش کروں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو خود ہی اس کی شخصیت سامنے آ جائے گی۔" جج صاحب نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن اس طرح خدانخواستہ آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو؟" انسپکٹر نعمانی نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم فکر نہ کرو۔"

"بہت بہتر! تو پھر میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر نعمانی نے ان سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔

رات کے کھانے کے بعد جج صاحب کافی دیر تک

قانون کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے عادی تھے۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے اور کتابوں میں کھو گئے۔ گھر کے دوسرے افراد گھر کے دوسرے حصے میں تھے۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ انور علی خان چونک اٹھے، اس وقت ان سے ملاقات کے لیے کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ ان کے دل و دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہیں زرد لفافے کا خیال آ گیا۔ وہ تیزی سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھے تاکہ کوئی ان سے پہلے دروازے کو نہ کھول دے، لیکن انہیں دیر سے خیال آیا تھا، ان کا ملازم نصرت خان ان سے پہلے ہی دروازہ کھولنے کے لیے جا چکا تھا، اس سے پہلے کہ وہ اسے آواز دے کر روکتے، وہ دروازے کی چٹخنی گرا کر دروازہ کھول چکا تھا، انہوں نے نصرت خان کو فوراً ہی چونکتے دیکھا۔

○

محمود، فاروق اور فرزانہ خان رحمان کے گھر صرف شام کو چائے پینے کے لیے آئے تھے۔ وہ بھی حامد، سرور اور ناز کی فرمائش پر۔ لیکن خان رحمان انہیں رات کا کھانا کھلا کر رخصت کرنے پر اڑ گئے اور اس سلسلے میں انہوں نے ظہور کو لمبا چوڑا کھانا تیار کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ ظہور نے یہ حکم سن کر محمود، فاروق اور

فرزانہ کو بڑی تیز نظروں سے گھورا تھا جیسے کہہ رہا ہو، اگر تم لوگ نہ آئے ہوتے تو مجھے صرف ایک چیز تیار کرنا پڑتی، لیکن اب بیسوں چیزیں تیار کرنا پڑیں گی، تاہم وہ خان رحمان کو سامنے منہ سے کچھ نہ کہہ سکا، لیکن خان رحمان سے اس کی یہ تیز نظریں چھپی نہ رہ سکیں، انہوں نے کڑک کر کہا۔

"کیا بات ہے۔ تم ان تینوں کو اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟"

"جی.... نج.... نہیں تو۔" وہ ہکلایا۔

"اوپر سے جھوٹ بھی بولتے ہو۔" خان رحمان غرائے۔

"جی اوپر سے۔ خدا کی قسم میں نے اوپر سے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"جلد بتاؤ۔ تم نے انہیں کیوں گھورا۔ کیا تم نہیں جانتے، یہ اس گھر کے لیے کس قدر اہم ہیں۔"

"جی ہاں! بالکل جانتا ہوں، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"تو پھر صرف ایک گھنٹے کے لیے کان پکڑ لو، اس کے بعد میں تمہیں سچے دل سے معاف کر دوں گا۔" انہوں نے کہا۔

"جی ایک گھنٹے کے لیے..... مر گیا۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"ایک گھنٹے کے لیے تم ہرگز نہیں مر سکتے، مرو گے تو ہمیشہ کے لیے مرو گے یعنی قیامت کے روز تک، اس دن ضرور دوبارہ

"زندہ کیسے جاؤ گے"۔ خان رحمان نے کہا۔

"جی میرا مطلب تھا ایک گھنٹے کے لیے کان پکڑنے کے بعد میں ادھ موا تو ضرور ہو جاؤں گا اور اس صورت میں ان لوگوں کے لیے کھانا کس طرح تیار کر سکوں گا"۔ اس نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ آدمی تو عقل مند ہو۔ خیر پہلے تم کھانا تیار کر لو، جب فارغ ہو جاؤ تو میرے پاس آ کر ایک گھنٹے کے لیے کان پکڑ لینا"۔

"ارے باپ رے! بات تو وہیں رہی"۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔

"انکل! میرا خیال ہے، اس بار اسے معاف کر دیں، اگر آئندہ کبھی یہ ہمیں گھورے تو بے شک اسے ایک کی بجائے تین گھنٹے کے لیے کان پکڑا دیں"۔

"اگر تم سفارش کرتے ہو تو ٹھیک ہے۔ منظور کر لیتا ہوں"۔

اس طرح ظہور کی جان بچی اور انہیں رات کا کھانا کھانا پڑا۔ کھانے کے بعد خان رحمان نے انہیں اپنی کار میں بٹھایا اور سٹارٹ کیا ہی تھا کہ اس میں کوئی خرابی واقع ہو گئی۔ انسپکٹر جمشید کو وہ شام کی چائے کے بعد ہی فون کر چکے تھے

کہ تینوں رات کے کھانے کے بعد آئیں گے۔ گاڑی خراب ہوتے پر انہوں نے لاحول ولاقوۃ پڑھی تو فاروق بول اٹھا:

"انکل یہ کار ہے، کوئی شیطان نہیں، خیر آپ فکر نہ کریں، ہم ٹیکسی یا رکشے میں چلے جاتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے، میں کوئی رکشا یا ٹیکسی کرا دیتا ہوں"۔

دس منٹ بعد وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھے گھر کی طرف جا رہے تھے، لیکن اچانک ٹیکسی بھی سڑک کے ایک طرف رک گئی۔

"کیا ہوا بھائی"۔ محمود نے گھبرا کر پوچھا۔

"شاید پٹرول ختم ہو گیا، میں نے محفوظ پٹرول بھی شروع کر لیا تھا اور پھر ڈلوانا بھول گیا۔ اب اس میں ایک قطرہ بھی نہیں رہا"۔

"اللہ کی مرضی"۔ فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

تینوں اسے بل ادا کر کے نیچے اتر آئے تھے۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ شدید سردی کا موسم، سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ آدھی رات کا سماں لگتا تھا، کبھی کبھار کوئی کار گزر جاتی۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا:

"کیا خیال ہے۔ پیدل مارچ نہ کریں"۔ محمود نے کہا

"ہاں! صرف ایک میل کا تو فاصلہ ہی ہے۔ بس ذرا دانت ہی بجیں گے نا"۔ فاروق نے سہمی صورت بنا کر کہا اور ڈرائیور مسکرانے لگا۔

"بھئی ہو سکتا ہے، یہاں آدھ گھنٹے تک کوئی ٹیکسی یا رکشہ نہ آئے، اس سے تو پیدل چلنا ہی بہتر رہے گا۔" محمود بولا۔

"ہوں! بات تو ٹھیک ہے، چلو پھر۔" فرزانہ نے کہا۔

فاروق کچھ نہ بولا۔ بس ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے راستے کو مختصر کرنے کے لیے ایک ذیلی سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔

"شاید آج ہمارا ستارہ گردش میں ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ملاقات نہیں ہوئی اس سے، ورنہ پوچھتا ضرور کہ بھائی کیا بات ہے، تمہیں کیا تکلیف ہے، یہ گردش کرنے کی کیا سوجھی۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"یار یہ حسرت ہی رہی کہ کبھی تم بھی کوئی کام کی بات کرو گے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"اس سڑک پر آخر کام کی بات کی ضرورت بھی کیا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"تو بے تکی باتوں کی بھی کونسی خاص ضرورت ہے۔" فرزانہ نے بھی تیز آواز میں کہا۔ اسے غصہ آگیا تھا۔

"راستہ کاٹنا ہے، ایک میل کا سفر ہے اور وہ بھی شدید سردی کے عالم میں، ادھر ادھر کی نہ ہانکیں گے تو یہ راستہ اور بھی طویل معلوم ہوگا۔" فاروق کہتا چلا گیا۔

"اچھا بھائی ہانک لو، ہمارا کیا جاتا ہے۔" محمود نے سرد آہ بھری۔

"ابا جان اور امی جان اب پریشان ہو گئے ہوں گے۔ شاید وہ انکل خان رحمان کو فون بھی کریں اور جب وہ انہیں بتائیں گے کہ ہم تینوں تو ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ بھی ہو چکے ہیں تو اُن کی پریشانی ایک دم بڑھ جائے گی۔" فرزانہ نے کہا۔

"تو پھر! تم کیا چاہتی ہو، ہم کیا کریں، ہم کیا کر سکتے ہیں۔" محمود نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کم از کم تیز تیز قدم تو اُٹھا ہی سکتے ہیں۔"

"اس سردی میں یہی غنیمت ہے کہ قدم اُٹھا تو رہے ہیں۔" فاروق تڑ سے بولا۔ اور اسی وقت ٹھٹک کر رہ گیا۔

"کیا ہوا، کیا اب قدم اٹھانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا ہے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

فاروق نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔ ایک سمت میں ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ اب تو انہوں نے بھی حیران ہو کر ادھر دیکھا۔ پہلے تو نیم تاریکی میں انہیں کچھ نظر نہ آیا، پھر وہ بھی چونک سے گئے اور چند قدم آگے بڑھ گئے۔ دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

دھماکا

نصرت خاں کو دروازے میں دو لڑکے اور ایک لڑکی کھڑے نظر آئے تھے، لیکن انہیں دیکھ کر تو چونکنے والی کوئی بات نہ تھی، وہ تو اس لیے چونکا تھا کہ تینوں کافی گھبرائے ہوئے تھے۔

"یہاں کون رہتا ہے؟" محمود نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ جج انوار علی خان کا بنگلہ ہے۔" ملازم نے جواب دیا۔

"ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ جلدی کرو۔" محمود بولا۔

"ایسی کیا خاص بات ہے۔ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" نصرت خان بولا۔

"یہ وقت باتوں کا نہیں، فوراً جج صاحب کو بلاؤ، ان کی جان خطرے میں ہے۔" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیا بات ہے نصرت، دروازے پر کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"یہ جج صاحب کی آواز ہے؟" فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں!" اس کے منہ سے نکلا۔

محمود اور فاروق نے ملازم کو ایک دھکا دیا اور اندر داخل ہو گئے۔

یہ دیکھ کر جج صاحب بوکھلا اُٹھے۔ ان کا ہاتھ فوراً جیب میں رینگ گیا، دوسرے ہی لمحے ہاتھ باہر نکلا تو اس میں پستول تھا، انہوں نے گرج دار آواز میں کہا:

"خبردار آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہاتھ اوپر اُٹھا لو۔"

"ٹھیک ہے، ہم آگے نہیں بڑھیں گے اور اگر آپ ہمارے ہاتھ اٹھوا کر ہی خوش ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر یہ بھی کیے لیتے ہیں، لیکن مہربانی فرما کر خود باہر نکل کر اپنے باغ کا جائزہ لے لیں۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا، تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو اور تم نے اب تک ہاتھ اوپر کیوں نہیں اٹھائے۔"

"چلو بھئی اٹھاؤ ہاتھ لو، کرو نیکی، کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، نیکی کر دریا میں ڈال، لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ہم یہاں دریا کہاں سے لائیں، کہنے والے کو دراصل یہ کہنا چاہیے تھا کہ نیکی کر کنوئیں میں ڈال، لیکن یہ بھی غلط ہوتا، کیونکہ اب کنوؤں کا دور بھی تو نہیں رہا۔ ہاں ٹھیک ہے، آج کے دور میں یہ محاورہ اس طرح ہو گا، نیکی کر، گھر کے تالاب میں ڈال۔"

"فاروق! وقت نازک ہے! جج صاحب آپ پستول کو جیب میں رکھ لیں اور ذرا ہمارے ساتھ باہر آئیں۔"

"میں تمہارے ساتھ ہرگز باہر نہیں جاؤں گا۔ بلکہ پولیس کو فون کروں گا۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔" فاروق بولا۔

"چاہے کچھ ہو جائے، میں پولیس کو فون کر کے تمہیں ان کے حوالے ضرور کروں گا۔" جج صاحب نے اٹل فیصلہ سنایا۔

"جج صاحب! آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔" فرزانہ نے تنگ آ کر کہا۔

"کیا کہا! میری زندگی خطرے میں ہے۔" انہوں نے چلا کر کہا۔

"ہاں۔ نہ صرف آپ کی بلکہ آپ کے سب گھر والوں کی بھی اور اب تو ہماری بھی۔ کیونکہ ہم بھی بنگلے میں داخل ہو چکے ہیں۔" محمود نے بتایا۔

"چلو کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" جج صاحب نے بوکھلا کر کہا۔

"باہر چل کر بات کریں۔ گھر کے سب لوگوں کو بھی فوراً گھر سے باہر نکال دیں۔" محمود نے کہا۔ تینوں کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔

"تم بات تو بتاتے نہیں۔"

"یہ بنگلہ ابھی بھک سے اڑ جائے گا، اس میں کسی جگہ ڈائنامیٹ لگایا جا چکا ہے۔"

"کیا!!" جج صاحب پوری قوت سے چلائے۔ ان کی آواز سن کر گھر کے دوسرے افراد بھی دوڑے آئے۔ جج صاحب نے فوراً سب کو گھر سے نکلنے کا حکم دیا پھر ان سے بولے:

"تم تینوں بھی نکل جاؤ، میں اس وقت تک باہر نہیں نکلوں گا جب تک کہ میرے بیوی بچے باہر نہ نکل جائیں۔"

"ہم انہیں جلد از جلد نکالنے کی کوشش کیوں نہ کریں۔ میری درخواست ہے کہ سامان کی پروا نہ کی جائے، بس خالی ہاتھ باہر نکل آیا جائے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" انہوں نے کہا اور پھر بلند آواز میں بولے۔ "سب سامان اندر ہی رہنے دو اور فوراً گھر سے باہر نکل آؤ۔"

ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ جج صاحب کی بیوی اور تین بچے بدحواسی کے عالم میں باہر کی طرف دوڑتے نظر آئے۔

"نصرت خان تم بھی باہر چلو!"

"لیکن سر آپ۔" نصرت خان ہکلایا۔

"میں سب سے آخر میں نکلوں گا۔" انہوں نے کہا

"لیکن میں آپ سے پہلے نہیں نکلوں گا۔" اس نے بضد ہو کر کہا۔

اتنی دیر میں بیگم اور بچے باہر نکل چکے تھے۔ فوراً ہی وہ سب

بھی باہر کی طرف لپکے۔ ادھر وہ باہر نکلے، ادھر ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور وہ سب اوندھے منہ گرے۔ گرد کے بادل نے انہیں اپنے اندر چھپا لیا۔ آس پاس کی عمارتوں کی کھڑکیاں، دروازے اور شیشے تھرتھرا اٹھے۔ کھڑکیاں کھلنے لگیں، لوگ خوفزدہ نظروں سے اس طرف دیکھنے لگے، پھر کسی پڑوسی نے فائر بریگیڈ اور پولیس کو فون کر دیا۔ جب پولیس اور فائر بریگیڈ والے پہنچے تو گرد چھٹ چکی تھی، آگ نہیں لگی تھی اور گھر کے افراد بنگلے سے باہر کچھ فاصلے پر بے ہوش پڑے تھے۔ ان سب کو اٹھا کر فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ اس وقت کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان میں تین بچے ایسے بھی تھے جو جج صاحب کے گھر کے افراد نہیں تھے۔

○

خان رحمان کے فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے انسپکٹر جمشید کہہ رہے تھے:

"بھئی کیا بچوں کو اب رات بھر رکھنے کا پروگرام بن گیا ہے؟"

"کیا مطلب؟" خان رحمان چونکے۔

"تمہارے چونکنے سے میں بھی چونک اٹھا ہوں، کیا وہ

یہاں سے روانہ ہو چکے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں! انہیں تو بہت پہلے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔" خان رحمان نے گھبرا کر کہا۔

"اوہو، پھر تو ضرور کوئی گڑبڑ ہے، اچھا میں دیکھتا ہوں۔"

"میں بھی ادھر سے روانہ ہوتا ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"نہیں، تم تکلیف نہ کرو، میں انہیں دیکھ لوں گا۔" انسپکٹر جمشید بولے اور ریسیور رکھ کر جلدی جلدی بیگم کو فون پر ہونے والی گفتگو بتائی اور پھر گھر سے نکل کر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اس سڑک پر روانہ ہو گئے جس پر جا کر خان رحمان کا گھر آتا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے اور ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ تقریباً دس منٹ تک چلنے کے بعد ایک جگہ انہیں بھیڑ نظر آئی۔ انہوں نے بریک لگائے اور ایک تماشائی سے پوچھا:

"کیوں بھئی! یہاں کیا ہوا ہے؟" ساتھ ہی ان کی نظر ایک مکان پر پڑی جو ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا، ان کے منہ سے نکلا۔

"ارے! یہ کیا ہوا؟"

"یہ جج انوار علی خاں کی کوٹھی تھی جناب! آدھ گھنٹے پہلے ایک دھماکا ہوا تھا اور بس پوری کوٹھی ملبے میں تبدیل ہو گئی۔" اس آدمی نے بتایا۔

"اور جج صاحب، ان کے گھر والے، ان سب کا کیا بنا؟" انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ گھر کے باہر بے ہوش پائے گئے تھے، ان سب کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

انسپکٹر جمشید نے چند لمحے سوچا اور پھر آگے چل پڑے، لیکن وہ تینوں انہیں کہیں نظر نہ آئے۔ کچھ اور آگے انہیں خان رحمان مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ گھر سے اس جگہ تک تینوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

"تب پھر ہسپتال میں جا کر دیکھنا پڑے گا۔ کہیں وہ اس حادثے کی لپیٹ میں نہ آ گئے ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے خان رحمان کو جج انوار علی خاں کی کوٹھی کے بارے میں بتایا۔

"ارے! وہ تو میرے بہت اچھے دوست ہیں، میں بھی ساتھ ہی چلوں گا، ان کی مزاج پرسی ہو جائے گی۔" خان رحمان بولے۔

ہسپتال کے ایک بڑے کمرے میں انہیں ایک ساتھ رکھا گیا تھا۔ یہاں انہیں محمود، فاروق اور فرزانہ بھی نظر آئے، یہ سب بال بال بچ گئے تھے، بس دھماکے کے اثر سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ اب سب ہوش میں تھے۔ خان رحمان کو دیکھ کر جج صاحب کے منہ پر رونق آ گئی:

"میرے دوست تمہیں کس طرح اطلاع مل گئی؟"

"ایک اتفاق کے ذریعے، آپ کا کیا حال ہے؟" خان رحمان نے پوچھا۔

"بس زندگی تھی، ورنہ ختم ہونے میں تو کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی، اس نے ان تین فرشتوں کو مدد کے لیے بھیج دیا۔" انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"فرشتے! ارے جج صاحب یہ تو اپنے انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں۔" خان رحمان ہنسے۔

"کیا!! جج صاحب کے منہ سے نکلا اور ان کے ساتھ ان کے گھر کے باقی افراد کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔

"نہیں!!" یہ نہیں جج صاحب کی تیرہ چودہ سالہ لڑکی روحی انوار کے منہ سے نکلا تھا۔

"اس میں نہیں کی کیا بات ہے روحی بیٹی، یہ واقعی محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں اور یہ جو میرے ساتھ ہیں، یہ انسپکٹر جمشید ہی ہیں۔"

"اوہو۔ ارے!" روحی نے حیرت زدہ انداز میں کہا

خان رحمان انہیں ایک دوسرے کے بارے میں بتانے لگے۔ ہسپتال والوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھی جج صاحب کے گھر کے فرد سمجھ کر اس کمرے کے بستروں پر لٹا دیا تھا۔ صدمے کا اثر زیادہ نہیں تھا، وہ سب وقتی طور پر بے ہوش ہو

گئے تھے، چنانچہ ڈاکٹر نے اجازت دے دی۔ لیکن الجھن یہ تھی
کہ جج صاحب کا گھر تو ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ خان رحمان کی
تجویز یہ تھی کہ جب تک ان کا گھر دوبارہ تعمیر نہیں ہو جاتا،
وہ اُن کے گھر ٹھہریں، جب کہ وہ ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتے
تھے، ان کا ارادہ اپنے چچا زاد بھائی جواد علی خان کے گھر ٹھہرنے
کا تھا۔ اس پر خان رحمان نے کہا:

"جواد علی خان تو ابھی تک یہاں پہنچے بھی نہیں جب کہ میں
آ چکا ہوں، لہٰذا میرا حق زیادہ ہے اور پھر آج کل میرے بیوی
بچے بھی گھر نہیں ہیں۔"

"جواد علی کو ابھی اطلاع نہیں ملی ہو گی، ورنہ وہ تو اڑ کر
پہنچتے۔" انوار علی خان ہنس کر بولے۔

"وہ اڑ کر پہنچیں یا تیر کر، آپ میرے ساتھ چلیں گے۔"

"میرا خیال ہے، مناسب بھی یہی ہو گا۔" انسپکٹر جمشید
بول پڑے۔

"وہ کیسے؟" جج صاحب نے چونک کر پوچھا۔

"اس طرح کہ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون شخص ہے
جو آپ کی جان لینا چاہتا ہے بلکہ اس نے آپ کے ساتھ آپ
کے گھر کے سب افراد کو ہلاک کرنے کی ٹھان لی، آخر وہ کون
ہے۔ اُسے کیا دشمنی ہے۔ میں خان رحمان کے گھر چل کر سب

سے پہلا سوال آپ سے یہی کروں گا کہ آپ سے کس کس کی
دشمنی ہے، آپ اس سوال کا جواب ابھی سے سوچنا شروع کر
دیں، اس کیس میں یہ سب سے اہم سوال ہے۔ اس کیس کی
تفتیش اسی وقت سے میں اپنے ذمے لیتا ہوں۔ کیونکہ آپ
خان رحمان کے دوست ہیں، لہٰذا میرے بھی دوست ہوئے۔
پولیس والے آئیں گے، سوالات کر کے چلے جائیں گے۔ اپنے
رخ سے تفتیش کرتے رہیں گے اور میں اپنے نظریے کے مطابق،
آپ سب پر یہ قاتلانہ حملہ تھا، مجرم کو ڈھونڈنا بہت ضروری
ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے، پھر وار کر سکتا ہے۔"

"اوہ مجھے یاد آیا۔ آج ہی ڈاک سے مجھے ایک خط ملا
تھا، اس میں کسی نے دھمکی دی تھی کہ مجھے قتل کر دے گا۔" جج
صاحب نے چونک کر کہا۔

"بہت خوب! یہ تو ایک اچھی صورت حال ہے۔ ہم اس خط
سے بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں، لیکن وہ خط تو ملبے کے ڈھیر
تلے دب گیا ہو گا۔" انہوں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"جی نہیں، میں نے اپنے علاقے کے انسپکٹر پولیس کو بلا کر
وہ خط اس کے حوالے کر دیا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ بتائیے انسپکٹر کا نام کیا ہے؟"
انہوں نے پوچھا۔

"انسپکٹر سراج نعمانی۔"

"انسپکٹر سراج نعمانی!" وہ بڑبڑائے اور کسی سوچ میں گم ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب ہسپتال سے رخصت ہو کر خان رحمان کی کار میں بیٹھ کر ان کے گھر کا رُخ کر رہے تھے۔ راستے میں محمود، فاروق اور فرزانہ نے انہیں بتایا کہ کس طرح جج صاحب کی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ انہیں تار بچھے ہوئے نظر آئے تھے۔ اور انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ یہاں کسی جگہ ڈائنامیٹ لگایا گیا ہے ڈائنامیٹ تلاش کرنے کی بجائے انہوں نے یہ مناسب جانا تھا کہ گھر کے افراد کو باہر نکال لیں، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اس وقت سب کے سب نہ جانے کس حال میں ہوتے۔ انسپکٹر جمشید ابھی تک کسی گہری سوچ میں گم تھے، یہاں تک کہ وہ خان رحمان کے گھر پہنچ گئے، لیکن ابھی انہیں ڈرائنگ روم میں اطمینان سے بیٹھنا نصیب بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ظہور نے دروازہ کھولا اور پھر انہوں نے دیکھا، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بوکھلایا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"لیجیے! جواد علی آ گئے۔" جج صاحب کے منہ سے نکلا۔

"بھائی جان! مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی، فوراً ہسپتال پہنچا اور

وہاں سے پتا چلا کہ آپ ادھر کے لیے روانہ ہو چکے ہیں تو ادھر دوڑا آیا، لیکن آپ یہاں کیوں چلے آئے۔ کیا میں مر گیا ہوں۔"

"خان رحمان پر ضد سوار ہو گئی تھی۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔" جج صاحب بولے۔

"ایسا کس ظالم نے کیا، کون تھا وہ؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں، ان سے ملیے، یہ انسپکٹر جمشید ہیں اور یہ ان کے بچے محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں، انہی تینوں نے آج ہماری جان بچائی ہے۔"

"بھئی واہ! ان کے بارے میں جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔" جواد علی خوش ہو کر بولا۔

"میرا خیال ہے۔ جج صاحب! آپ اب تک میرے سوال کا جواب سوچ چکے ہوں گے۔ جواب ملنے پر میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا، البتہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ آج رات یہیں رہیں گے۔"

"یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ہاں تو ہاں آپ کے سوال کا جواب سوچ چکا ہوں۔ مجھے شیفنے پر شک ہے۔" انہوں نے کہا۔

"شیفنے پر؟ یہ شیفنے کون ہے؟" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

ایک غنڈہ ، ٹھہریئے میں تفصیل سے سناتا ہوں۔ واقعہ پوری
تفصیل سے بتانا ہو گا۔" یہ کہہ کر جج صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے،
وہ کافی فکر مند لگ رہے تھے۔

"یہ آج سے ......" انہوں نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ دروازے
پر زور دار قسم کی آواز آئی ، جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے
دروازہ کھٹکھٹایا ہو۔

"ظہور! دیکھو، کون بدتمیز ہے" خان رحمان چلائے۔

"ابھی دیکھتا ہوں جناب" ظہور نے بھی باہر سے چلا کر کہا اور
انہوں نے اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی ، جج صاحب
بھی اپنی کہانی درمیان میں روک کر ڈرائینگ روم کے دروازے کیطرف متوجہ
ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہی انہوں نے ظہور کی چیخ کی آواز سنی ۔
انسپکٹر جمشید نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی اور
بیرونی دروازے کی طرف دوڑے ۔ محمود ، فاروق اور فرزانہ نے
بھی ان کا ساتھ دیا۔

انہوں نے دیکھا، ظہور خوف زدہ سا کھڑا تھا اور دروازے
میں ایک خنجر گڑا تھا۔ اس خنجر کے نیچے ایک تہ کیا ہوا زرد
رنگ کا کاغذ نظر آ رہا تھا ۔ انسپکٹر جمشید نے رومال کے
ذریعے چاقو کو ہینڈل سے پکڑ کر باہر کھینچا اور وہ محمود کو پکڑا کر
خود کاغذ کھول ڈالا ۔ اتنی دیر میں باقی سب لوگ بھی دروازے

پر پہنچ چکے تھے۔ زرد رنگ کے کاغذ پر لکھا تھا۔

"جج صاحب! میں آپ کو چھوڑوں گا ہرگز
نہیں، آپ کہیں بھی پناہ لے لیں، آپ
کو قتل ضرور کروں گا، کیونکہ میں نے اپنی
زندگی کا مقصد یہی بنا لیا ہے۔"

سب بے ہوش

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے۔ سب گم صم کھڑے ایک
دوسرے کو دیکھ رہے تھے، آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"ہم یہاں کب تک کھڑے رہیں گے، اندر ہی چل کر بیٹھنا چاہیے
ابھی ہمیں جج صاحب کی وہ بات بھی سننا ہے۔ ہو سکتا ہے، اسی
سے کوئی سراغ مل جائے۔"

آخر وہ سب پھر اندر آ کر بیٹھ گئے۔ خنجر کو انسپکٹر جمشید نے محفوظ
کر لیا تھا اور اس خط کو بھی تہ کر کے جیب میں رکھ لیا تھا۔
ساتھ ہی وہ گھر فون کر چکے تھے، تاکہ بیگم جمشید پریشان نہ ہوتی
رہیں۔ کچھ دیر بعد جج انوار علی صاحب نے پھر سے کہنا شروع کیا:

"یہ آج سے تین ماہ پہلے کی بات ہے، میری عدالت میں
ایک کیس لگا، چند بدمعاشوں نے ایک بوڑھی عورت کی زمین
کے چھوٹے سے ٹکڑے پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ بڑھیا کا ایک بیٹا
بھی تھا۔ وہ طیش میں آ گیا اور ان سے لڑ پڑا، بس انہوں نے
مل کر اُسے ختم کر دیا۔ کیس بالکل صاف تھا، اس میں کوئی الجھن

نہیں تھی۔ میں نے گواہوں کے بیانات، واقعات سننے کے بعد
فیصلے کی تاریخ مقرر کر دی۔ فیصلے سے ایک روز پہلے میرے گھر کے
دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیٹی روحی نے دروازہ کھولا تو
وہاں ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے روحی کو بتایا۔ میرا نام شفیق
ہے، مجھے جج صاحب سے ایک ضروری کام ہے۔ روحی نے اُسے
ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مجھے اطلاع دی۔ شفیق نام کے کسی
آدمی کو میں نہیں جانتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو میں نے
محسوس کیا، بوڑھیا کے بیٹے کے کیس کی سماعت کے دوران عدالت
میں یہ شخص باقاعدگی سے آتا رہا ہے۔ لیکن وہ کیس کا گواہ نہیں تھا۔
شکل صورت سے وہ مجھے کوئی اچھا آدمی نہیں لگا۔ خیر میں نے
اس سے پوچھا:

"ہاں بھئی، کیا بات ہے؟"

"جناب! میرا نام شفیق ہے۔" اس نے ہاتھوں کو حرکت دیتے
ہوئے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت پریشان ہے۔

"میری بچی مجھے یہ بات بتا چکی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جی ہاں! میں آپ کے لیے ایک چیز لے کر آیا ہوں۔"

اس نے پراسرار لہجے میں کہا اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ خدا
جانے وہ کیا چیز لے کر آیا تھا۔

"کیا چیز لے کر آئے ہو، صاف صاف کہو!" میں نے کہا۔

"وہ چیز یہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ
ڈالا اور کاغذ میں پٹا ہوا ایک پیکٹ میز پر رکھ دیا، پھر ایک
اور پیکٹ نکالا، اس طرح اس نے چار پیکٹ نکالے اور پھر
بولا:
"ان چار پیکٹوں میں پچیس پچیس ہزار روپے ہیں اور یہ آپ
کے لیے ہیں۔"
"کیا مطلب؟" میں زور سے چونکا، میری سٹی گم ہو گئی۔
"کل آپ جن ملزموں کا فیصلہ سنانے والے ہیں، اگر انہیں
بری کر دیں تو یہ ایک لاکھ روپیہ آپ کا ہے۔ یہ ان کے گھر
والوں نے جمع کر کے آپ تک پہنچانے کے لیے مجھے دیا ہے۔"
"لیکن تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔
"میں ان ملزموں کا گہرا دوست ہوں" اس نے کہا۔
"بہت خوب! کیا تم چند منٹ انتظار کر سکتے ہو، میں دوسرے
کمرے میں جا کر فائل دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ میں ان میں سے کسی
کو یا سب کو چھوڑ سکتا ہوں یا نہیں۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔
"اچھی بات ہے۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور میں دوسرے کمرے
میں آیا۔ فائل دیکھنے کا تو صرف بہانا کیا تھا، میں نے انسپکٹر
سراج نعمانی کو فون کیا کہ فوراً چلا آئے۔ انسپکٹر نعمانی میرے علاقے
کے پولیس اسٹیشن کے انچارج ہیں اور مجھ سے ان کی اکثر ملاقات

ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ وہ فوراً پہنچ گئے۔ اس دوران میں دوبارہ
ڈرائنگ روم میں جا چکا تھا اور جاتے ہی شیفے سے بات چیت
شروع کر چکا تھا تاکہ وہ کچھ بھانپ نہ سکے۔ میں نے اسے
باتوں میں لگاتے ہوئے بتایا کہ ان ملزموں کو چھوڑنا بہت مشکل ہے۔
کیس ان پر ہر لحاظ سے ثابت ہو چکا ہے، اگر میں نے چھوڑا
تو سب بھانپ لیں گے، اس کے باوجود اگر تم اس رقم میں کچھ
اضافہ کر سکو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی ایک یا دو کو ضرور چھوڑ
دوں گا۔ ملزم کل چار تھے، اس نے جواب میں کہا کہ اگر چھوڑنا ہے
تو چاروں کو چھوڑ دیں۔ میں پچاس ہزار روپے اور دے سکتا ہوں۔
یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ گھر کا بیرونی دروازہ کھلا اور انسپکٹر
نعمانی بغیر دستک دیے اندر آ گیا۔ وہ پوری وردی میں تھا، اسے دیکھ
کر شیفے کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے میز پر پڑے بنڈلوں کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہ رہے انسپکٹر صاحب وہ بنڈل جو یہ شخص مجھے بطور رشوت
دینا چاہتا ہے۔"
شیفے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کی
طرف دوڑا، مگر انسپکٹر سراج نعمانی اپنے ساتھ چند کانسٹیبل لایا
تھا، جنہیں اس نے باہر ہی ٹھہرنے کی ہدایت کی تھی، اس طرح
بھاگتے ہوئے شیفے کو پکڑ لیا گیا۔ اس پر رشوت لینے کے الزام

میں مقدمہ درج ہوا اور چھ ماہ قید سخت کی سزا ہو گئی ، ادھر میں
نے چاروں ملزم کو سزائے موت سنا دی ... اور یہ واقعہ آج سے
چھ ماہ پہلے کا ہے۔"

یہاں تک کہہ کر جج صاحب خاموش ہو گئے۔ چند لمحے تک
خاموشی طاری رہی پھر انسپکٹر جمشید بولے:

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شفیقہ جیل سے رہا ہو کر آگیا
ہے اور یہ وہی ہے جو انتقام لینے پر تلا ہوا ہے۔"

"بالکل یہی بات ! اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"
انہوں نے کہا۔

"خیر! میں شفیقے کو بھی چیک کروں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔
محمود ، فاروق اور فرزانہ کو یہیں چھوڑے جا رہا ہوں ، اگرچہ یہاں
خان رحمان موجود ہی ہیں۔ تاہم احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ یہ
تینوں بھی یہاں رہیں۔ آپ لوگ دروازے اندر سے بند رکھیں۔
میں اب صبح آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت جج صاحب
کے بھائی جواد علی نے کہا:

"بھائی جان! میں بھی یہیں رہوں گا ، آپ کو مصیبت میں گھرا
چھوڑ کر گھر جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"جیسے تمہاری مرضی"! جج صاحب نے منظوری دی۔

"لیکن میرا خیال ہے ، اس کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے گھر
جا کر آرام کریں۔ جج صاحب کی حفاظت کے لیے یہاں کافی لوگ
ہیں" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"جی نہیں ، اس کے باوجود میں یہیں ٹھہروں گا۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے اور ان تینوں کو ایک
طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دور آنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"ابھی تک میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ بہر حال میں پہلے
تو انسپکٹر نعمانی سے ملوں گا ، اس سے شفیقے کے بارے میں معلومات
حاصل کروں گا اور بعد میں شفیقے سے ملاقات کروں گا۔ شاید اس
طرح میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں۔ اگر میں نے ضروری سمجھا تو واپس
یہاں آؤں گا ، ورنہ گھر جا کر سو رہوں گا ، تم لوگ آنکھیں اور کان
کھلے رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری موجودگی میں جج صاحب پر
حملہ ہو جائے اور انہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔ جج صاحب بہت
نیک آدمی ہیں۔ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ رشوت سے کوسوں
دور بھاگتے ہیں ، لہٰذا ایسے آدمی کو بے رحم لوگوں کے ہاتھوں نہیں
مرنا چاہیے۔"

"لیکن ابا جان! سوتے وقت ہم اپنی آنکھیں اور کان کس طرح
کھلے رکھ سکتے ہیں۔" فاروق نے سوال جڑ دیا۔

"اس طرح کہ جب بھی تمہاری آنکھیں بند ہونے لگیں، محمود تمہارے گال پر ایک زوردار طمانچہ دے مارے گا۔ محمود میری طرف سے اجازت ہے۔" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

"ارے باپ رے!" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"بہت بہتر ابا جان! اگر اس نے پلک بھی جھپکی تو میرا طمانچہ پورے زور سے اس کے گال پر پڑے گا۔ لحاظ اس لیے نہیں کروں گا کہ یہ آپ کا حکم ہے۔"

"لیکن ابا جان نے پلک جھپکنے سے کب منع کیا ہے، پلکیں تو جھپکنا ہی پڑیں گی۔"

"اچھا بھائی جھپک لینا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گئے کہ کہیں فاروق پھر کوئی بات نہ کہہ دے۔

"لو میں پلکیں جھپک رہا ہوں، مار کر دکھاؤ طمانچہ۔" یہ کہہ کر فاروق نے جلدی جلدی پلکیں جھپکانا شروع کر دیا۔

"میرا دماغ نہیں چل گیا کہ اس طرح تمہارا گال سرخ کر دوں، سونے لگو گے تو ضرور ایسا کروں گا۔" محمود مسکرایا۔

"لیکن ساری رات جاگتے رہنے کی کیا ضرورت ہے، گھر کے اندر بھلا جج صاحب کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ابا جان کا حکم ہے، ہمیں اس پر عمل کرنا ہی ہو گا۔"

وہ جب واپس ڈرائینگ روم کی طرف آئے تو جواد علی خان

کو انہوں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کمرے سے نکلتے دیکھا:

"کیا ہوا جناب!" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"وہ۔ وہ۔ انوار علی خان۔ میرا بھائی۔"

"کیا ہوا انہیں؟"

"پپ پتا نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت گہری نیند سو گئے ہوں.... میں نے بہت ہلایا جلایا، لیکن وہ نہیں جاگے۔" جواد علی خان نے گھبرائے ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن ابھی ابھی تو وہ بالکل ٹھیک تھے۔ شیشے کے بارے میں بتا رہے تھے۔" فرزانہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! خدا جانے کیا چکر ہے۔ لیکن اب وہ سب کے سب سو رہے ہیں۔" جواد علی خان نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"کیا کہا.... سب کے سب!"

اور وہ ڈرائینگ روم کے دروازے کی طرف تیزی سے دوڑ پڑے۔

○

ابھی صرف ایک دو منٹ پہلے وہ ڈرائینگ روم میں سب کو ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گئے تھے، لیکن اب یوں لگتا تھا جیسے

...نہوں نے نیند کی گولیاں کھالی ہوں۔ ان میں سے کوئی صوفے
...یں گر گیا تھا، کوئی کرسی سے ڈھلک کر فرش پر لیٹ گیا تھا،
یہاں تک کر خان رحمان بھی گہری نیند سو چکے تھے۔
ان کی حیرت کا کیا پوچھنا۔ دوڑ کر ان کے پاس پہنچے۔ ان
کی نبضیں بھی... دل کی دھڑکنیں سنیں اور پھر ایک دوسرے
کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔ آخر محمود
نے ڈرائینگ... سے نکلتے ہوئے کہا۔
"دوڑ کر باہر چلو۔ دشمن ابا جان کو روک لینا چاہیے، ان کا یہاں
رکنا ضروری ہے۔"
"تم دونوں جاؤ، میں... یہیں ٹھہروں گی۔ تینوں کا گھر سے
نکل کر دوڑ پڑنا مناسب نہیں ہوگا، کم از کم ایک آدمی کو ضرور
یہاں ٹھہرنا چاہیے۔"
"ٹھیک ہے نواب زادی صاحبہ.... لیکن بیرونی دروازے اندر سے
بند کر لو۔" فاروق نے جل کر کہا اور دونوں دروازہ کھول کر باہر
نکل گئے۔ فرزانہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کرنا چاہا،
لیکن دروازے میں سے ایک سیاہ ہاتھ نے نمودار ہو کر اس کی
ناک کا مزاج پوچھ لیا، وہ چکرا کر گری۔ گرتے گرتے اس نے دیکھا،
وہ جو کوئی بھی تھا، لمبے قد کا اور پتلا دبلا آدمی تھا اور چہرہ
اس نے پوری طرح اوور کوٹ کے کالروں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ

...مکا واقعی اس زور کا تھا کہ فرزانہ کی
گرتے ہی بے سدھ ہو گئی۔
جگہ کوئی اور ہوتا تو مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا، لیکن وہ
بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ تاہم جان بوجھ کر بے ہوش بن گئی
تھی۔ لمبا آدمی جب ڈرائینگ روم کی طرف چلا گیا تو وہ جلد
...اٹھی اور بیرونی دروازے کو دیکھا۔ لمبے آدمی نے چٹخنی
لگائی تھی، اس نے بھی دروازے کو اسی حالت میں چھوڑا
اور دبے پاؤں بغیر ڈرائینگ روم کے دروازے پر پہنچ گئی
پھر... اس کی سٹی گم ہو گئی کہ لمبے آدمی کے ہاتھ...
بے پھل والا ایک خنجر تھا اور وہ جج انوار علی کی طرف بڑھ رہا
تھا، جب کہ جواد علی ایک کونے میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا
تھا۔ موت اس کے بھائی کی طرف بڑھ رہی تھی اور وہ تھر تھر
کانپنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن فرزانہ یہ کیسے برداشت
کر سکتی تھی۔ انہیں تو یہاں چھوڑا ہی ان کی حفاظت کے لیے
گیا تھا۔ وہ پورے زور سے چلائی:
"خبردار! تم ایسا نہیں کر سکتے۔"
حملہ آور چونک کر مڑا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔
اس کے خیال میں تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی اور شاید اسے
اپنے مکے پر بہت ناز بھی تھا:
"حیرت ہے تم بے ہوش نہیں ہوئیں۔"

"حیرانی بعد میں ہوتے رہنا، پہلے اپنا چہرہ دکھا دو۔ عورتوں کی طرح منہ کیوں چھپا رکھا ہے۔ اب تو عورتوں نے بھی پردہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ بھی اسلام کے اصولوں سے ہٹ گئی ہیں، پھر تم کیسے مرد ہو کر پردہ کرنے لگے ہو اور وہ بھی اس عالم میں کہ ایک ہاتھ میں خنجر بھی پکڑ رکھا ہے۔" فرزانہ مذاق اڑانے والے انداز میں کہتی چلی گئی۔

"پہلے تم سے ہی کیوں نہ نبٹ لوں۔ میرا چہرہ دیکھ کر بھی تم نہیں جان سکو گی، میں کون ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ فرزانہ کی طرف مڑا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ فرزانہ ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس کھڑی تھی جب کہ لمبا آدمی خنجر ہاتھ میں لیے اس کی طرف ایک ایک قدم بڑھ رہا تھا۔

"خنجر چلانے سے پہلے مجھے اپنا چہرہ ضرور دکھا دو، تاکہ میں مرنے کے بعد تمہارا حلیہ اپنے ابا جان کو بتا سکوں۔"

"ضرور دکھاؤں گا۔ لیکن اس وقت جب خنجر تمہارے سینے میں اتر چکا ہو گا اور تم تڑپ رہی ہو گی۔ اس وقت میں تمہیں اپنا چہرہ ضرور دکھاؤں گا۔"

"کیا تمہارا نام شیفہ ہے؟"

"شیفہ ہی کہہ لو۔ مجھے ناموں کی کبھی پروا نہیں ہوئی۔" اس

نے کہا۔

"یہ بتاؤ، تم شیفے ہو یا نہیں؟" فرزانہ نے اس کے خنجر اور ہاتھ پر نظریں جماتے ہوئے کہا، کیونکہ یہ تو ثابت تھا کہ اب وہ حملہ کیے بغیر نہیں جائے گا۔ دوسری طرف وہ اسے باتوں میں لگا کر وقت گزار رہی تھی، دراصل وہ یہ چاہتی تھی کہ محمود، فاروق اور ان کے ابا جان جلد از جلد یہاں آ جائیں۔ لیکن پھر لمبا آدمی اس کے نزدیک آ گیا، محمود اور فاروق واپس نہ آئے۔ فرزانہ کو بہت حیرت ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے خطرہ بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، کیونکہ محمود اور فاروق کو اگر باہر ان کے والد نظر نہیں آئے تھے تو انہیں فوراً واپس تو آنا چاہیے تھا، انہیں معلوم تھا، اندر حالات ٹھیک نہیں ہیں اور یہی بات فرزانہ کو فکر میں مبتلا کر رہی تھی۔ اسے اپنی نہیں محمود اور فاروق کی فکر کھائے جا رہی تھی اور اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ انسپکٹر جمشید جا چکے ہیں۔

اسی وقت لمبا آدمی اس کے سر پہ آ گیا۔

شیفہ آگیا

انسپکٹر جمشید تھانے کے اندر داخل ہوئے، سامنے ہی ایس ایچ او نعمانی اپنے دفتر میں بیٹھا نظر آیا۔ ادھر اس کی نظر انسپکٹر جمشید پر پڑی تو حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں، انسپکٹر جمشید اس کے تھانے میں کبھی نہیں آئے تھے، نہ ہی ان کی آپس میں کہیں ملاقات ہوئی تھی، تاہم وہ انہیں پہچانتا تو تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اٹھا اور بولا:

"انسپکٹر صاحب آپ؟"

"جی ہاں؛ صرف یہ جاننے آیا ہوں کہ شیفہ جیل سے رہا ہو چکا ہے یا نہیں، اس کا پتا کیا ہے، وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے۔ شیفے کے بارے میں آپ جو کچھ بھی جانتے ہیں، بتا دیں۔"

"آپ اس شیفے کی بات کر رہے ہیں جو جج انوار علی خان کو رشوت دینے کے الزام میں گرفتار ہوا تھا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ہاں؛ بالکل اسی کے بارے میں۔" وہ بولے۔

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ جیل سے رہا ہو چکا ہے۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے۔ میں اس کا پتا کاغذ پر لکھے دیتا ہوں۔"

اس نے پتا لکھ دیا۔

"کچھ، ان قاتلوں سے اس کا کیا تعلق تھا؟"

"سننے میں آیا ہے کہ وہ اس کے دوست تھے۔" اسس

"صرف دوست یا کوئی رشتہ بھی تھا۔" انہوں نے پوچھا۔

"رشتے کے بارے میں تو معلوم نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی وہ موقع پر پکڑا گیا تھا اور اس کے گواہ جج انوار علی اور میں تھے۔ لہٰذا رشوت ستانی کے جج نے ایک دو پیشیوں پر ہی اس کے خلاف فیصلہ سنا دیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"بہت خوب، خیر میں اس سے جا کر مل لیتا ہوں۔"

"لیکن معاملہ کیا ہے، آپ شیفے میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"آپ کو یہ اطلاع تو مل چکی ہو گی کہ جج انوار علی صاحب کا گھر ڈائنامیٹ کے ذریعے اڑا دیا گیا ہے۔"

"جی ہاں! مجھے اطلاع مل چکی ہے، میرے ہی علاقے میں تو دھماکا ہوا ہے۔ میں تو اپنے عملے سمیت ابھی یہاں لوٹا ہوں۔"

"بہت خوب! تو پھر جج انوار صاحب کا خیال ہے کہ ان پر یہ حملہ شیشے کی طرف سے ہوا ہے اور وہ خط بھی اسی نے لکھا تھا، کیا آپ وہ خط مجھے دکھا سکتے ہیں۔"

"جی ہاں کیوں نہیں۔" اس نے کہا اور فائل میں سے خط نکال کر دکھا دیا۔ انہوں نے دیکھا۔ اس تحریر میں اور خان رحمان کے دروازے پر ملنے والی تحریر میں کوئی فرق نہیں تھا، لہذا انہوں نے یہ کاغذ انسپکٹر نعمانی کو واپس کر دیا۔ اور بولے:

"اسے سنبھال کر رکھیے گا، شاید مجرم کے خلاف یہ بہترین ثبوت ہو گا۔"

"جی ضرور! آپ بے فکر رہیں، کیا میں آپ کے ساتھ چلوں شیشے کے گھر تک؟" انسپکٹر نعمانی نے پوچھا۔

"جی نہیں! اس کی ضرورت نہیں، میں خود ہی اس سے مل لوں گا۔"

"میرا مطلب ہے، جہاں وہ رہتا ہے، وہ ایک خطرناک جگہ ہے۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے، کیونکہ انہوں نے ابھی انسپکٹر نعمانی کے لکھے ہوئے پتے پر نظر نہیں ڈالی تھی۔

"یہ ایک کلب کا پتا ہے اور اس کلب میں عام طور پر صرف غنڈے بیٹھتے ہیں۔ اگر ایک غنڈے سے بھی کوئی

جھگڑ پڑے تو سب غنڈے اس کا ساتھ دینے پر تل جاتے ہیں اور مخالف کو جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میں دیکھ لوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور تھانے سے نکل آئے۔ اپنی جیپ میں بیٹھتے وقت انہیں کوئی خیال آیا۔ گاڑی تیزی سے ایک طرف موڑی۔ پندرہ منٹ تک سڑک پر چلتے رہنے کے بعد جنگل کی حدود شروع ہو گئی تو انہوں نے سڑک سے نیچے اتار کر جیپ روک لی اور اندر بیٹھے بیٹھے ہی اپنے حلیے میں تبدیلی کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد ان کا حلیہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ اور اب انہیں محمود، فاروق اور فرزانہ بھی نہیں پہچان سکتے تھے، تاہم کپڑوں کے ذریعے وہ ضرور پہچانے جاتے، لیکن ان کے پاس اس کا بھی حل تھا۔ جیپ کے نیچے ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس میں سے انہوں نے دوسرے کپڑے نکال کر پہن لیے۔ اب انہیں کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جیپ واپس موڑ کر زیرو کلب کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ اسی کلب کا نام انسپکٹر نعمانی نے لکھ کر دیا تھا، یوں انہوں نے بھی اس کا نام سن رکھا تھا۔ یہ شہر سے کافی دور ایک الگ تھلگ علاقے میں تھا۔ یہ جگہ سمندر کے کنارے تھی، لیکن سمندر کا یہ کنارا بھی بالکل غیر آباد اور ویران تھا، سیر و تفریح

تفریح کے خواہش مند بھی اس طرف کا رُخ نہیں کرتے تھے، عام خیال یہ تھا کہ اس طرف سمندر کی موجیں بہت خوفناک ہوتی ہیں اور اگر ان کی لپیٹ میں کوئی آ جائے تو اس کا بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اس خوفناک مقام پر زیرو کلب بنایا گیا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے اس سے پہلے کبھی اس کا رُخ نہیں کیا تھا۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ آج کیا کرتے۔

کلب سے آدھ میل پہلے ہی انہوں نے جیپ ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑی کر دی۔ یہاں ایسے ٹیلے جا بجا تھے۔ جیپ سے اتر کر وہ پیدل ہی چل پڑے۔ پانچ منٹ بعد وہ کلب کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے دیکھا، کلب کی دیواروں پر ہزاروں رنگ دار بلب جگ مگ جگمگ کر رہے تھے۔ رات میں دن کا سماں تھا۔ ہال کے چاروں طرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ جن میں سے اندر بیٹھے ہوئے لوگ صاف نظر آ رہے تھے، باہر کاروں، موٹر سائیکلوں کا ہجوم تھا۔ اندر نظر آنے والے شکل و صورت کے لحاظ سے انہیں کسی بھی رُخ سے شریف نظر نہیں آئے۔ ان کے چہروں پر شیطانیت کا راج تھا، بے رحمی اور بے حسی ٹپک رہی تھی۔

وہ پُرسکون رفتار سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس وقت انہوں نے بھی اپنے چہرے پر چھپتے ہوئے بدمعاش کا میک اپ کر رکھا تھا۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار نے انہیں ایک نظر دیکھا اور پھر باادب ہو کر راستہ دے دیا۔ وہ اندر داخل ہونے کے بعد ایک خالی میز کی طرف بڑھ گئے۔ فوراً ہی ایک بیرا ان کی طرف بڑھا اور جھک کر بولا:

"کیا حاضر کروں جناب؟"

"ایک گلاس ٹھنڈا پانی۔" انہوں نے کھردری آواز میں کہا۔

"یہاں ٹھنڈا پانی نہیں ملتا۔" بیرے نے منہ بنا کر کہا۔ "اس طرف پہلی مرتبہ آئے ہو؟"

"کیا.... اس طرف پہلی مرتبہ آنا جرم ہے؟"

"نہیں جرم تو نہیں، لیکن یہاں سے پہلے اس ہوٹل کے کاؤنٹر پر جا کر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ پہلے تم کاؤنٹر پر جا کر اپنے بارے میں بتاؤ۔ پھر متعلقہ آدمی تمہیں بتائے گا کہ اس کلب میں آنے کی شرائط کیا ہیں۔ یہاں کیا کچھ ملتا ہے۔"

"بہت خوب! مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اب میں یہی کروں گا۔ فکر نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور کاؤنٹر پر پہنچے، کاؤنٹر والا پہلے ہی انہیں گھور رہا تھا۔

"میرا نام صدلت جنگ ہے۔ اس کلب کی سیر کا ارادہ ہے۔"

انہوں نے کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکا کر پوچھا۔

"پہلے اپنے بارے میں بتاؤ، کیا کرتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"چوریاں کرتا ہوں۔" وہ بولے۔

"یہاں چوروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ چور بزدل ہوتے ہیں۔"

"لیکن میں چور ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکو بھی ہوں اور قاتل بھی۔"

"یہ ہوئی بات! کتنے ڈاکے ڈالے اور کتنے قتل کیے۔" اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نو ڈاکے ڈالے اور تین قتل کیے ہیں۔"

"کبھی پکڑے بھی گئے؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی تک پولیس میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکی۔"

"بہت خوب! تم جیسے لوگوں کے لیے اس کلب کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں، جب چاہو، یہاں آ سکتے ہو۔ اگر پولیس پیچھے لگی ہو تو بھی یہاں آ سکتے ہو۔ تمھیں ایسی جگہ چھپایا جائے گا کہ پولیس کے فرشتے بھی نہ ڈھونڈ سکیں اور اس کے لیے تمھیں صرف پانچ ہزار روپے ماہوار ادا کرنے ہوں گے۔"

"یعنی پانچ ہزار ادا کیے بغیر کوئی اس کلب میں بیٹھ بھی نہیں سکتا۔"

"نہیں!" اس نے کہا اور انسپکٹر جمشید سوچ میں پڑ گئے۔ اس وقت ان کی جیب میں پانچ ہزار روپے نہیں تھے۔ کچھ سوچ کر انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں پانچ ہزار روپے صبح بینک سے نکلوا کر تمہیں دے دوں گا، اگر چیک لینا منظور کرو تو ابھی لکھ دوں۔"

"ٹھیک ہے، یہاں چیک بھی وصول کیے جاتے ہیں۔" اس نے کہا

"بہت خوب! تب تو بات بن گئی۔" یہ کہہ کر انہوں نے چیک لکھ دیا۔ اور بولے:

"اب یہ بتاؤ، یہاں کھانے پینے کو کیا ملتا ہے۔"

"سب کچھ ملے گا، ہر چیز کا بل نقد وصول کیا جائے گا۔ کلب کا ممبر بن جانے کے بعد یہ تمام ممبر تمہارے ساتھی بن چکے ہیں۔ کوئی بیرونی آدمی آنکھ اٹھا کر تمہاری طرف دیکھے گا تو یہ سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، یہاں میرا ایک دوست ہوا کرتا ہے۔ شیفو، ابھی چند دن پہلے ہی جیل سے رہا ہو کر آیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا اطلاع ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"شیفو! تو تم شیفو کے دوست بھی ہو۔ یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔ ٹھہرو۔ پہلے میں تمام لوگوں سے تمہارا تعارف

گرا دوں۔" یہ کہہ کر اس نے مائیک آن کیا اور اس میں بولا:

"خواتین و حضرات! آج ہمارے درمیان ایک نئے ساتھی کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ ہیں صولت جنگ۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی سب نے زور سے تالیاں بجائیں اور انہیں غور سے دیکھا۔

"ہاں تو شیفے کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا۔"

"شیفز یہاں ایک ہفتے پہلے آیا ضرور تھا، لیکن پھر نظر نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا۔"

"اچھا تو وہ جب بھی نظر آئے، اُسے بتا دینا صولت جنگ اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اسی وقت ایک لمبا آدمی اندر داخل ہوا اور سیدھا کاؤنٹر کی طرف آیا۔ اس نے جھک کر کہا۔

"ہیلو بابرے کیا حال ہے؟"

کاؤنٹر والے اور انسپکٹر جمشید نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا، پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ کاؤنٹر والے نے کہا۔

"ان سے ملو۔" آنے والے نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا اور حیران ہو کر بولا:

"یہ کون ہے؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"ارے تم اسے نہیں جانتے، جب کہ اس کا کہنا ہے کہ تم اس کے دوست ہو مسٹر شیفے۔" بابرا نے کہا۔

اور انسپکٹر جمشید زور سے چونکے۔ اس وقت انہیں خیال آیا ان سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ انسپکٹر لغاری سے شیفے کی تصویر لے کر نہیں دیکھی تھی۔ ادھر شیفز آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔

○

محمود اور فاروق جونہی دروازے سے باہر نکلے، کسی نے ان کے سروں پر کپڑا ڈال کر زوردار جھٹکا مارا۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے، ایک دوسرے میں الجھ کر گر پڑے۔ ساتھ ہی انہیں گھسیٹا جانے لگا۔ بے بسی کے عالم میں وہ گھسٹتے چلے گئے۔ حملہ آور شاید کئی تھے۔ اور پھر ان کے سروں پر تابڑ توڑ وار کیے گئے۔ جلد ہی وہ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو خان رحمان کے باغ میں پڑے تھے اور آس پاس کوئی نہ تھا۔ دونوں ہڑبڑا کر اٹھے، اور دروازے کی طرف بڑھے۔

"شاید ہم صرف دو یا تین منٹ بے ہوش رہے ہیں۔" محمود نے آہستہ آواز میں کہا۔

"یہ کیسے کہا جا سکتا ہے، ہو سکتا ہے ہم ایک آدھ گھنٹے پہلے بے ہوش رہے ہوں۔" فاروق بولا۔

"نہیں! گھڑی پر نظر ڈالو۔ صرف آدھ گھنٹہ پہلے تو ہم سب ہسپتال سے یہاں آئے تھے، پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے تھے اور جج صاحب نے اپنی کہانی سنائی تھی، شیفی پر شک کا اظہار کیا تھا۔ ابا جان تو شیفی کی تلاش میں نکل گئے تھے اور ادھر وہ سب کے سب بے ہوش ہو گئے۔ ہم ابا جان کو بلانے کے لیے نکلے تو یہ مصیبت ٹوٹ پڑی۔ اس کا مطلب ہے، یہ مصیبت ابھی دو تین منٹ پہلے ٹوٹی تھی، لہٰذا جلدی اندر چلو، خدا جانے اندر کیا حالات ہوں۔"

دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہو کر سیدھے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے، لیکن اس سے پہلے ایک کمرے کے اندر ان کی نظر ظہور پر پڑی۔ انہوں نے دیکھا، ظہور بندھا پڑا تھا۔ اب تو ان کی بوکھلاہٹ اور بڑھی۔ انہوں نے سوچا، ظہور کو تو بعد میں کھولیں گے، پہلے ڈرائنگ روم کی خبر لینی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے آگے بڑھے اور پھر ڈرائنگ روم سے آنے والی ایک آواز نے انہیں چونکا دیا، کسی نے چیخ کر کہا تھا۔

"پکڑ لو اسے۔"

وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ یا خدا یہ کیا چکر ہے، یہ کون لوگ ہیں جو جج صاحب کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں اور پھر انہیں فرزانہ کا خیال آیا۔ فرزانہ بھی تو ابھی مکان کے اندر تھی۔ فرزانہ کا خیال تو ان کے ذہنوں سے نکل ہی گیا تھا۔ اب ڈرائنگ روم کی طرف آواز پیدا کیے بغیر بڑھنا تھا، چنانچہ وہ دبے پاؤں آگے بڑھے۔ دروازے کے اندر انہیں خان رحمان اور انوار علی خان اپنے گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ اسی حالت میں بے ہوش پڑے نظر آئے، البتہ جواد علی خان اسی طرح کمرے کے کونے میں کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے، لیکن اس کے دوسری طرف منظر عجیب تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

پکڑلو اسے

لمبا آدمی جونہی فرزانہ کے بالکل نزدیک پہنچا، وہ انتہائی تیزی سے جھکی اور کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچ گئی۔ ساتھ ہی جھلا کر بولی۔

"تمہیں شرم نہیں آتی، اتنے لمبے ہو اور ایک لڑکی سے خنجر سے لڑ رہے ہو۔ خنجر ہاتھ سے گرا دو اور پھر مجھ سے لڑ کر دکھاؤ۔"

"مجھے بہادر بننے کا اتنا شوق نہیں۔" اس نے تلملا کر کہا اور پھر فرزانہ پر چھلانگ لگائی۔ فرزانہ ایک دم نیچے بیٹھ کر اس کی طرف کھسک گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فرزانہ والی جگہ پر گرا اور لڑکھڑا گیا۔

"اس طرح تو تم ساری رات مشق کرتے رہے، تب بھی کچھ نہیں بنے گا، مجھ سے مقابلہ کرنا ہے تو خنجر گرا دو۔" فرزانہ نے ہنس کر کہا۔

"میں تمہیں مزا چکھا دوں گا۔" وہ غرایا۔

"مزا! ہاں مزا میں ضرور چکھوں گی۔ میں ہر کھانے پینے کی چیز کا مزا چکھنے کی عادی ہوں تو کیوں نہ آج اس لڑائی کا مزا بھی چکھ لیا جائے، ویسے تم تو پہلے ہی چکھ چکے ہو گے۔" اس نے کہا۔

لمبے آدمی نے اس مرتبہ خنجر کو نوک پر سے پکڑ لیا۔ یہ دیکھ کر فرزانہ چونکی۔ اس نے جلدی سے کہا:

"معلوم ہوتا ہے، تم نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"ہاں! میں خنجر پھینکنے کا ماہر ہوں اور اب یہ خنجر تم پر پھینکوں گا۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"ہاں! تم نے سوچا، اس طرح تو میں قابو میں آتی نہیں، دوسری طرح کام نکالا جائے۔ لیکن یاد رکھنا، میری طرف آنے والا خنجر واپس مڑ کر خود تمہیں زخمی کر دے گا۔ پھر نہ کہنا، ایک فقیر کی دعا میرے کام آئے گی۔"

"میں نے ایسے بہت سے فقیر دیکھے ہیں۔" اس نے کہا اور پھر پلک جھپکتے میں خنجر اس پر کھینچ مارا۔ فرزانہ بھی بجلی کی سی تیزی سے اچھلی تھی اور خنجر اس سے چند انچ کے فاصلے سے گزر کر ایک الماری کے دروازے میں دھنس گیا۔ فرزانہ نے فوراً ہی کھڑکی کی طرف چھلانگ لگائی اور خنجر [illegible] میں سے نکال لیا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میری طرف آنے والا خنجر خود تمہاری طرف پلٹ پڑے گا۔" اس نے چہک کر کہا۔

لمبا آدمی دم بخود کھڑا فرزانہ کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک فرزانہ نے بھی خنجر نوک کی طرف سے پکڑ لیا اور اسے تولتے ہوئے بولی

"خنجر تمہاری طرف آنے لگا ہے، اس کے وار سے بچ کر دکھاؤ تو جانوں!"

"تم... تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتی، کیا تمہارے خیال میں مجھے خنجر پھینکنا نہیں آتا ہو گا، تم دیکھو گے کہ میں تم سے بہتر خنجر پھینکوں گی۔ میں تو تمہارے وار سے بال بال بچ گئی، اب تم بھی بال بال بچ کر دکھاؤ۔"

"بکواس! خنجر پھینک دو، یہ بچوں کا کھلونا نہیں ہے۔"

"ہاں! یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔" اس نے کہا اور انتہائی پھرتی سے ہاتھ کو حرکت دی، اس کے ساتھ ہی لمبے آدمی نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی، لیکن یہی اس کی غلطی تھی۔ فرزانہ نے اپنے ہاتھ کو حرکت ضرور دی تھی، لیکن خنجر ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ البتہ جب لمبا آدمی چھلانگ لگا چکا اور ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا تو فرزانہ نے خنجر ہاتھ سے چھوڑ دیا

خنجر تیر کی طرح گیا اور اس کی پنڈلی میں دھنس گیا۔ اس کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی اور وہ پنڈلی پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت انہوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی، فرزانہ بھی سمجھ گئی کہ محمود اور فاروق آ رہے ہیں، لیکن پھر فوراً ہی وہ چونک اٹھی، یہ آواز محمود اور فاروق کے قدموں کی تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی، وہ بوکھلا کر مڑی اور پھر اس نے دیکھا، دو لمبے تڑنگے آدمی اندر داخل ہو رہے تھے، انہیں دیکھتے ہی زخمی آدمی چلا اٹھا،

"پکڑ لو اسے۔"

○

"کون ہو مسٹر تم اور تم نے یہ کس طرح کہا کہ میرے دوست ہو۔" شیفی نے کہا۔

"الگ کمرے میں چل کر مجھ سے بات کر لو، میں ثابت کر دوں گا کہ میں نے غلط نہیں کہا۔" انسپکٹر جمشید نے پراسرار لہجے میں کہا۔

"اچھا! یہ بات ہے۔ تو آؤ میرے ساتھ۔"

اس نے انسپکٹر جمشید کا ہاتھ اس انداز میں پکڑا جیسے ڈر ہو کہ موقع ملتے ہی وہ بھاگنے کی کوشش کریں گے۔

"ارے بھائی میرے ہاتھ کی ہڈیاں کیوں توڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"ہاتھ ہی کی نہیں، اگر تم نے یہ بات ثابت نہ کی تو میں تمہاری باقی ماندہ ہڈیاں بھی ضرور توڑ دوں گا۔" اس نے غرا کر کہا اور انہیں اسی طرح ساتھ لیے زینے پر چڑھنے لگا۔

سیڑھیاں ختم ہونے پر ایک برآمدہ نظر آیا۔ برآمدے میں دو کمرے بنے تھے۔ ایک کے دروازے پر پہنچکر اس نے ان کا ہاتھ چھوڑے بغیر چابی جیب سے نکال کر تالے کے سوراخ میں لگائی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، پھر اندر سے چٹخنی لگا لی۔

"میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم دروازہ اندر سے بند کر لو۔"

"ابھی تم اور بہت کچھ چاہو گے۔" وہ سنگ دلی سے ہنسا۔

دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور انہیں ایک کرسی کی طرف دھکا دیتے ہوئے خود بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ، تم کون ہو اور تم نے کاؤنٹر کلرک سے یہ کیوں کہا کہ میرے دوست ہو۔" اس نے پوچھا۔

انسپکٹر جمشید اس کے دھکے سے لڑکھڑاتے ہوئے کرسی پر

جا گرے اور پھر خوفزدہ انداز میں بولے:

"اس لیے کہا تھا کہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔"

"چلو، مل چکے، اب یہ بتاؤ کیوں ملنا چاہتے تھے۔"

"جج انوار علی کے سلسلے میں!" انہوں نے گول مول لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب!" شیفے پہلی مرتبہ چونکا۔

"مطلب یہ کہ جج صاحب نے نہیں گرفتار کرایا تھا، کیونکہ تم نے انہیں رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے، تو پھر، اب کیا ہوا، میں اس جرم کی سزا بھگت چکا ہوں۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ان ملزموں سے تمہارا کیا تعلق تھا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ میرے دوست تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"نہیں! کچھ اور بھی تعلق تھا۔" انہوں نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ شیفے نے بھی یہ بات بھانپ لی، اس نے پریشان ہو کر پوچھا:

"آخر تم کون ہو اور یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے یہ بتاؤ کہ ان سے تمہارا کیا تعلق تھا۔" انہوں نے سرد آواز میں کہا۔

"اور کوئی تعلق نہیں تھا۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"کہیں وہ ملزم اس کلب کے ممبر تو نہیں تھے اور کلب کے تمام بدمعاشوں نے رقم جمع کر کے تمہیں نمائندہ بنا کر تو جج صاحب کے پاس نہیں بھیجا تھا؟" انسپکٹر جمشید نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

شیفے نے اس طرح چونک کر ان کی طرف دیکھا جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں اور پھر بولا:

"تت.... تم کون ہو؟"

"صولت خاں، اس کا مطلب ہے، میں نے ٹھیک ہی کہا ہے اور اس کا صاف مطلب یہ بھی ہے کہ یہ اس کلب کا اصول ہے، کوئی جرم کرنے پر پکڑا جائے تو اسے کسی نہ کسی طرح بچایا جائے، رشوت سے بھی کام نہ چلے تو بعد میں اس شخص سے اپنا بدلہ لیا جائے۔ جس نے مدد نہ کی ہو، اگر بات یہی ہے تو مجھے اس کلب کے مالک سے ملنا ہوگا۔"

"آخر تمہارا ان باتوں سے مطلب کیا ہے، تعلق کیا ہے۔ تم ہو کون؟"

"میں اپنا نام تمہیں کتنی مرتبہ بتاؤں، اب تم اس کلب کے مالک کا نام بتاؤ۔"

"کلب کے مالک کا نام تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب تم

اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ گے اور اگر نہیں بتاؤ گے تو اس کمرے سے باہر نہیں جا سکو گے، یہ کمرہ تمہارا مقبرہ بن جائے گا۔" شیفے بولا۔

"تو پھر سنو! میں اپنے بارے میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا، جتنا بتا چکا ہوں۔ لیکن میں تم سے کلب کے مالک کا نام معلوم کر کے رہوں گا۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید تیزی سے کرسی سے اٹھے اور بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر شیفے کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔ یہ سب کچھ اس طرح ہو گیا جیسے کوئی بہت طاقت ور آدمی کسی ننھے منے بچے کا بازو پکڑ کر مروڑ دے۔ شیفے کا منہ حیرت اور تکلیف سے کھل گیا۔ آنکھوں میں بھی حیرت کا سمندر تیرنے لگا۔

"تت... تم۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"میرے بارے میں نہیں، کلب کے مالک کے بارے میں بتاؤ، نہیں تو بازو ٹوٹنے میں ایک جھٹکے کی کسر ہے۔" انہوں نے غرّا کر کہا۔

"کلب کے مالک کا نام شمشام ہے۔" اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

" وہ کہاں ملے گا؟"

" کلب کی سب سے اوپر والی منزل کے کمرے میں۔ اس منزل میں بس وہی ایک کمرہ ہے" اس نے بتایا۔

" اگر یہ غلط ہوا تو میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں" انہوں نے کہا اور اس کی کنپٹی پر دوسرا ہاتھ رسید کر دیا، کنپٹی پر ہاتھ کا لگنا تھا کہ شیفہ مکمل طور پر بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے اسے کمرے کے فرش پر ڈالا اور دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ پھر شیفے کی جیب سے کمرے کی چابی نکالی اور باہر نکل کر تالا لگا دیا۔ برآمدے میں اِدھر اُدھر دیکھنے پر انہیں ایک زینہ نظر آیا جو شاید تیسری منزل کے لیے تھا۔ وہ زینے کے ذریعے اوپر پہنچے۔ یہاں واقعی صرف ایک کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ پہلے تو انہوں نے دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا اور پھر دستک دی۔ دروازہ چند سیکنڈ بعد ہی کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے نے باہر نہیں دیکھا تھا، بلکہ چٹخنی گرانے کے بعد دوسری طرف مڑ گیا تھا، انسپکٹر جمشید اندر داخل ہوئے تو اس آدمی کی کمر نظر آئی۔ یہ کافی موٹا تازہ آدمی تھا:

" کیا بات ہے شیفے، خیر تو ہے:"

ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر وہ گھوما اور پھر بری طرح چونکا:

" کون ہو تم؟"

" میرا نام صولت خان ہے شمشام عرف بادشاہ؟"

" بادشاہ! تمہیں میرا یہ نام کس نے بتایا؟" اس نے بھڑک کر پوچھا۔

" شیفے نے بتایا تھا کہ تم اس کمرے میں ملو گے۔"

" غلط کہتے ہو، شیفے کو نہیں معلوم کہ میرا اصل نام بادشاہ ہے۔ میرے اس نام سے اس شہر میں صرف دو آدمی واقف ہیں"

" اور وہ دو کون ہیں؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

" ایک میں خود اور دوسرا انسپکٹر جمشید، اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میرے سامنے انسپکٹر جمشید کھڑا ہے"

" کیا میں غلط کہہ رہا ہوں" یہ کہتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ جیب میں ڈالا اور پستول نکال لیا۔

" اگر میں انسپکٹر جمشید ہوں تو تم اس پستول سے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، کیوں ٹھیک ہے نا، لہٰذا اسے جیب میں رکھ لو" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

" لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

" اطمینان سے بات کریں گے، پستول جیب میں رکھ لو"

" تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ انسپکٹر

کچھ نہیں بگاڑ سکتا، میں نے اس دوران نشانہ بازی کی بہت
مشق کی ہے۔"
"بیس سال تک قانون سے چھپے رہنے کے بعد تم اگر
میرے سامنے آ گئے ہو تو میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔
اگر مجھے پہلے یہ معلوم ہو جاتا کہ زیرو کلب کا مالک بیس سال
پہلے کا نامی گرامی بدمعاش بادشاہ ہے۔ جس نے پورے شہر کو
انگلیوں پر نچا مارا تھا، جس کے خوف اور دہشت سے کوئی
محفوظ نہ تھا، جس نے لوٹ مار کا بازار گرم کر کے رکھ دیا
تھا، جو بے رحم تھا، قاتل تھا، جس نے نہ جانے کتنے گھر
اجاڑ دیے تھے..... وہ میرے ہاتھ سے صرف اس لیے بھاگ
نکلا تھا کہ ایک بچے کی جان بچانا میرے نزدیک زیادہ ضروری
تھا۔ تم اگر اس بچے کو درمیان میں نہ لے آتے تو بچ کر نہیں
جا سکتے تھے، لیکن آج میرے اور تمہارے درمیان کوئی بچہ نہیں
نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ تم اس دوران برابر نشانہ بازی کی
مشق کرتے رہے ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم بیس سال سے
برابر مجھ سے خوف زدہ رہے ہو۔ تقدیر مجھے ایک بار پھر
تمہارے سامنے لے آئی ہے، بیس سال پہلے بچے کو درمیان
میں لانے سے پہلے تم نے مجھ پر فائر کیے تھے، لیکن میں تمہارا
یہ وار بچا گیا تھا اور تمہارا خیال ہے کہ میں آج وار نہیں بچا

سکوں گا تو کرو فائر۔ تم اپنے دل کی حسرت پوری کر لو۔"
ان کے الفاظ ختم ہوتے ہی بادشاہ نے فائر جھونک مارا۔
وہ پہلے ہی تیار تھے، گولی سر پر سے گزر گئی۔ بادشاہ حیرت زدہ
رہ گیا۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی، یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید
بولے:
"ابھی بھی وقت ہے۔ پستول جیب میں رکھ لو اور مجھ سے
دوستانہ ماحول میں بات کر لو، قانون کے حوالے تو میں تمہیں
ہر حال میں کروں گا۔"
فوراً ہی دوسرا فائر ہوا۔ انسپکٹر جمشید اچھلے اور گولی ان کے
نیچے سے نکل گئی۔
"ابھی تمہیں بیس سال اور مشق کرنے کی ضرورت ہے، لیکن
اب تمہیں بیس سال ملیں گے نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
ان کی نظریں بدستور بادشاہ کی اس انگلی پر جمی تھیں جو ٹریگر
پر تھی۔ تیسرا فائر ہوا اور انہوں نے بجلی کی طرح تڑپ کر
خود کو گولی سے بچایا۔ اس بار وہ بال بال بچے تھے۔
"بس کرو، چھٹی گولی چلانے کے بعد کیا کرو گے۔ اس وقت
اپنے بال ہی نوچنے کی سوچو گے۔"
"پروا نہیں، میں چھ کی چھ گولیاں تم پر چلاؤں گا۔" یہ کہتے
ہی اس نے تین فائر ایک ساتھ کر ڈالے۔ دراصل وہ چاہتا

تھا کہ انہیں سنبھلنے کا موقع نہ ملے، لیکن تینوں فائر انہوں نے ادھر ادھر اُچھل کر ضائع کر دیے۔

"اب یہ پستول اپنے سر پہ دے مارو۔" انسپکٹر جمشید ہنسے۔

"اپنے نہیں تمہارے سر پہ!" یہ کہہ کر اس نے پستول کھینچ مارا جسے انسپکٹر جمشید نے کرکٹ کی گیند سمجھ کر دبوچ لیا۔

"اب کیا کرو گے بادشاہ سلامت!"

"تم اب بھی میرے رحم و کرم پر ہو، اس کلب کے تمام غنڈوں کو اشارہ کرنے کی دیر ہے، وہ تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے۔"

"لیکن تم انہیں بلاؤ گے کیسے، میں خود بھی اوپر آنے سے پہلے اس کلب کا ممبر بن چکا ہوں، شیفو اپنے کمرے میں بے ہوش پڑا ہے اور آدھ گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔"

"میں ایک گھنٹی بجاؤں گا اور عملے کے کئی آدمی اوپر آ جائیں گے۔ پھر میں انہیں حکم دوں گا کہ ہال میں جتنے بھی بدمعاش موجود ہیں، انہیں اوپر لے آؤ۔" بادشاہ نے بتایا۔

"بٹن دبا دو۔" انسپکٹر جمشید نے پرسکون آواز میں کہا۔ ساتھ ہی ان کا ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ بادشاہ نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور پھر دیوار پر لگے ایک بٹن کی طرف دائیں ہاتھ کی انگلی بڑھا دی۔ فوراً ہی ایک فائر ہوا اور انگلی کا ایک پور اڑ

اڑگیا۔ بادشاہ کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی۔

"تم اب بوڑھے ہوگئے ہو بادشاہ، جیل میں ہی ٹھیک رہو گے۔ ویسے ابھی تمہاری نو انگلیاں باقی ہیں، اچھا ہو تو ان سے بھی کام لے سکتے ہو۔" وہ مسکرائے۔

"تم کیا چاہتے ہو۔" اس نے تکلیف زدہ آواز میں کہا۔

"جج انوار علی خاں کا گھر ڈائنامیٹ سے کس نے اڑایا تھا، کیا شیفو نے۔"

"نہیں! میں نے شیفو کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔"

"تو پھر کیا اس نے اپنی مرضی سے ایسا کیا ہوگا۔"

"اگر وہ ایسا کرتا تو مجھے ضرور بتاتا۔"

"لیکن شیفو نے مجھے بتایا ہے کہ کلب کے ممبروں کو چھڑانے کے لیے رشوت کا سہارا لیا جاتا ہے اور اگر رشوت سے کام نہیں چلتا، یہاں کے ممبروں کو سزا ہو جاتی ہے تو اس جج یا متعلقہ آدمی سے انتقام لیا جاتا ہے، کیا یہ درست نہیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں! یہ درست ہے، لیکن ابھی تک ہم نے جج انوار علی کے بارے میں کوئی اقدام نہیں کیا تھا.... شاید شیفو نے یہ خیال کیا ہو کہ میں نے یہ کام اس کے علاوہ کسی اور سے کرایا ہے۔"

"ہوں! آخر اب تم کیا چاہتے ہو، کیا چپ چاپ میرے ساتھ

چھوڑ گے یا اس کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"دوسرا کیا۔ تم تیسرا بھی اختیار کر لو۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" اس نے اپنی بازو کو پوری طاقت سے بھینچتے ہوئے کہا تاکہ خون بہنا بند ہو جائے، لیکن خون نے رکنے کا نام نہ لیا۔

"اگر تم خون خرابہ ہی کرانے پر تل گئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اب اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ میں ایک فون کروں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے پستول جیب سے نکال لیا۔ پہلا فائر انہوں نے جیب کے اندر سے ہی کیا تھا۔

اب انھوں نے ریسیور اٹھا کر میز پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے کسی کے نمبر گھمانے لگے۔ پھر ریسیور اٹھا کر بولے:

"ہیلو! میں انسپکٹر جمشید عرض کر رہا ہوں۔ آپ کا بیس سال پرانا مجرم بادشاہ زیرو کلب کی اوپر والی منزل میں موجود ہے۔ اس پورے کلب کو گھیرے میں لے لیا جائے اور سب لوگوں کو گرفتار کر لیا جائے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا اور بادشاہ سے بولے:

کرنل رحمانی آ رہے ہیں۔ یہ کیس انہی کے پاس تھا۔ اب جب تک وہ نہیں آ جاتے، تم آرام کرو۔" ساتھ ہی انہوں نے ایک مکا اس کی ناک پر اس زور کا دیا کہ وہ تیورا کر گرا۔ یہی نہیں انھوں نے دائیں ہاتھ کی بڈی اس کی پیشانی پر بھی ماری

تاکہ وقت سے پہلے ہوش میں آنے کا امکان نہ رہے۔ پھر کمرے سے نکل کر دروازہ باہر سے بند کیا۔ چابی تالے میں ہی چھوڑ دی اور نیچے اتر آئے۔ شیفنے کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو وہ بھی بند تھا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ہال میں آئے اور کاؤنٹر والے سے بولے:

"مسٹر شیفے سے ملاقات خوش گوار رہی، اب میں یہاں روزانہ آیا کروں گا۔"

"مجھے خوشی ہو گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

اور انسپکٹر جمشید وہاں سے نکل کر پھر خان رحمان کے گھر طرف روانہ ہو گئے۔ تاکہ معلوم کر سکے، وہاں کیا حالات ہیں۔

لڑائی کا کھیل

محمود اور فاروق نے کمرے میں ایک زخمی آدمی کو دیکھا جو پنڈلی پکڑے بیٹھا تھا اور فرش پر خون بہہ رہا تھا۔ دو آدمی فرزانہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر محمود نے کہا:

"اسے پکڑنے سے پہلے اگر تم ہمیں پکڑ لو تو بہتر ہو گا۔"

اس کا جملہ سن کر وہ چاروں چونکے۔ فرزانہ کے چہرے پر رونق دوڑ گئی۔ اس نے خوش ہو کر کہا:

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا، میں تھک بھی بہت گئی ہوں۔"

"تھک گئی ہو تو آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو بھئی، آپس میں بات چیت کر کے طے کر لیتے ہیں، آخر یہ چکر کیا ہے۔ جج صاحب سے آپ لوگوں کی دشمنی کیا ہے؟" فاروق نے کھلنڈرے انداز میں کہا۔

"جج صاحب نے ہمارے دوستوں کو پھانسی دلوائی تھی، ہم

انہیں نہیں چھوڑیں گے۔" زخمی پنڈلی والے نے کہا۔

"پہلے اپنی پنڈلی تو سنبھال لو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"وہ جج صاحب نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔" محمود بولا۔

"ٹھیک ہے، اب ہم اپنا فرض ادا کریں گے۔" وہ بولا۔

"اچھا بھائی کرو، ہم دیکھتے ہیں تم اپنا فرض کس طرح پورا کرو گے۔" محمود نے تنگ آ کر کہا۔

"پہلے تو تم دونوں کی چٹنی بنائیں گے پھر جج صاحب اور ان کے بیوی بچوں سے نمٹیں گے۔" ایک بولا۔

"جی ہاں! جیسے تمہارے ساتھی نے ہماری بہن کی چٹنی بنائی ہے، ویسی ہی چٹنی تم ہماری بناؤ گے۔ معلوم ہوتا ہے، تمہیں چٹنی کا بہت شوق ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

دونوں جھلا اٹھے۔ اندھا دھند محمود اور فاروق کی طرف دوڑے۔ فرزانہ یہ دیکھ کر چلا اٹھی:

"محمود، فاروق بچو!"

"ہماری نظر کمزور نہیں ہے۔ چپ چاپ بیٹھی تماشا دیکھتی رہو اور اگر ہم ان دونوں کے مقابلے میں کمزور پڑتے نظر آئیں تو مدد کے لیے کود پڑنا، کیونکہ جج صاحب، ان کے گھر والوں اور انکل خان رحمان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ ادھر ظہور بے چارہ بھی رسیوں سے بندھا پڑا ہے۔"

"یا اللہ رحم! یہ ہو کیا رہا ہے۔" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔ پھر بولی: "تم ان سے نمٹو، میں اسے کھول کر آتی ہوں۔"

"اور اگر انہوں نے واقعی ہماری چٹنی بنا دی۔" محمود نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ اس دوران دونوں حملہ آوروں کے حملوں کا جواب بھی دیتے رہے تھے اور فرزانہ سے باتیں بھی کر رہے تھے۔

"اچھا تو میں لڑائی کا فیصلہ ہونے تک یہیں ٹھہروں گی۔" اس نے کہا اور دلچسپی سے لڑائی کا منظر دیکھنے لگی۔ ابھی تک دونوں حملہ آور محمود اور فاروق کو چھو بھی نہیں سکے تھے۔ یہ دیکھ دیکھ کر فرزانہ خوش ہو رہی تھی، بچوں کی طرح تالیاں بجا رہی تھی۔

"واہ واہ! کیا انداز ہے لڑنے کا، نہ کپڑے خراب ہوں، نہ چوٹ لگے اور دشمن گدھوں کی طرح ہانپنے لگ جائے۔"

"زیادہ باتیں نہ بناؤ، انہیں غصہ آ جائے گا۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے تو کیا اس وقت تک یہ غصے کے بغیر ہی لڑتے رہے ہیں۔" محمود نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"تو اور کیا، انہیں غصہ آیا نہیں اور انہوں نے تمہیں ناچ نچایا نہیں۔" فرزانہ بولی۔

"پھر تو واقعی انہیں غصہ نہیں دلانا چاہیے، دیکھو بھئی غصہ

نہ کھانا، کیونکہ غصہ کھانا حرام تو ہوتا ہے، عقل کو بھی مار دیتا ہے، غصہ ایک آگ ہے جس میں انسان جل بھن کر راکھ ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے، تم راکھ ہو جانا پسند نہیں کرو گے۔" فاروق تیزی سے کہتا چلا گیا۔

"غصے پر تقریر ختم ہو گئی۔" محمود نے جل کر کہا۔

"ہاں! ہو گئی، اب اگر تم کچھ اور الفاظ کا اضافہ کرنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" فاروق نے کہا۔

"لیکن مجھے اعتراض ہو گا، کیونکہ اس طرح ان دونوں کو واقعی غصہ آ جائے گا۔"

تینوں کی باتوں نے انہیں واقعی تپا دیا اور وہ اندھا دھند انداز میں ان کی طرف بڑھے اور بڑھے بھی دو مختلف سمتوں سے۔ یہ دیکھ کر وہ دونوں تیزی سے اِدھر اُدھر ہٹ گئے اور وہ اپنی ہی جھونک میں...... ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ فرزانہ نے پرجوش انداز میں تالی بجا دی۔

"بھئی بہت خوب! ناریلوں کے ٹکرانے سے بھی ایسی ہی آواز پیدا ہوتی ہے۔"

"بس تالیاں ہی بجاتی رہو، ہاتھ پیر نہ ہلانا۔" محمود نے منہ بنایا۔

"مجھے شامل ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے، تم ان سے

بہت خوبصورتی سے نبٹ رہے ہو۔" فرزانہ نے جواب میں کہا۔

"لو! اب نبٹنے میں بھی خوبصورتی گھس گئی۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"خوبصورتی کا کیا ہے۔ ہر چیز میں گھس سکتی ہے، یہاں تک کہ بدصورتی میں بھی گھس جاتی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"فاروق کی طرح بے تکی شروع کر دیں تم نے۔" محمود نے اسے گھور کر دیکھا۔

اور یہ گھور کر دیکھنا ہی اسے لے بیٹھا۔ ایک مکا اس کی کنپٹی پر پڑا اور وہ لڑکھڑا گیا۔

"یہ مجھے گھور کر دیکھنے کی سزا ملی ہے تمہیں، اب کبھی ایسا نہ کرنا۔" فرزانہ نے نصیحت کی۔

محمود فوراً ہی سنبھل گیا تھا، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں حملہ آور فاروق کو چھوڑ کر ایک دم محمود پر ٹوٹ پڑے اور ایک لمحے کے لیے وہ بوکھلا گیا، پھر بجلی کی طرح تڑپا، ان کے گھیرے میں سے نکلا اور دور جا کھڑا ہوا، اس وقت تک اسے گھیرا دیکھ کر فاروق مدد کے لیے آگے بڑھ چکا تھا، نتیجہ یہ ہوا، ان دونوں نے جو حملہ مل کر محمود پر کیا تھا، اس کی زد میں فاروق آ گیا۔ دو طرف سے اس پر مکے اور لاتیں پڑیں اور وہ بلبلا اٹھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو، آدمیوں کی طرح لڑو۔" اس نے چیخ کر کہا۔

محمود اور فرزانہ کو فوراً ہی اس کی نازک پوزیشن کا احساس ہوا اور اگر وہ فوراً ہی درمیان میں نہ کود پڑتے تو فاروق ضرور مار کھا گیا تھا، کیونکہ دونوں حملہ آور کچھ کم طاقت ور نہیں تھے، یہ تو اس وقت تک اچھل کود کر بس ان کے وار بچاتے رہے تھے۔

اور پھر ایک ہولناک لڑائی شروع ہو گئی۔ دونوں حملہ آور بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے، ادھر یہ تینوں اب اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک آدھ مکا بھی رسید کرنے لگے۔ دوسری طرف جواد علی خاں تھا، وہ اب تک اسی کونے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ شاید اس قسم کا منظر اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ لڑائی بھڑائی سے اسکا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اچانک محمود کو کچھ خیال آیا، اس نے چونک کر کہا۔

"جواد علی صاحب! آپ تھر تھر کانپنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے، اتنا بھی نہیں کہ پولیس کو فون ہی کر دیں۔"

جواد علی نے ایک دم تھر تھر کانپنا بند کر دیا، جیسے سوتے میں جاگ پڑا ہو۔ پھر بولا۔

"واقعی! یہ کام تو مجھے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے فون کرنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک نئی بات ہوئی، زخمی پنڈلی والا جو اس وقت تک پنڈلی سے خنجر نکال چکا تھا اور شاید اپنی حالت پر کچھ قابو پا چکا تھا، خنجر ہاتھ میں لیے اس کے راستے میں آ گیا اور خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھتے ہوئے غرایا:

"خبردار! تم فون نہیں کر سکتے۔ اور لڑکو تم بھی اس لڑائی کے کھیل کو بند کر دو، ورنہ میں خنجر جواد علی کے سینے میں اتار دوں گا۔"

محمود، فاروق اور فرزانہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ان کے ہاتھ پیر رک گئے۔ انہوں نے بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف بھی دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، اب کیا کریں۔

"اب یہ تینوں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، تم لوگ جلدی جلدی اپنا کام مکمل کر لو، پھر ہم یہاں سے چل نکلیں گے۔" زخمی پنڈلی والے نے کہا۔

"تم لوگ ہو کون اور چاہتے کیا ہو؟" محمود نے تیکھے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" زخمی نے کہا۔

اتنی دیر میں اس کے ساتھی جیبوں سے ریشمی ڈوری کے پھندے نکال چکے تھے۔ ان پھندوں کو دیکھ کر محمود، فاروق اور فرزانہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ ان کا مطلب بخوبی سمجھتے تھے، گلا گھونٹنے کے لیے ایسے ہی پھندے استعمال کیے جاتے تھے۔ اور پھر ان کے قدم انوار علی خان اور ان کے بیوی بچوں کی طرف اٹھنے لگے۔

تینوں بوکھلا اٹھے۔ اب اگر وہ انہیں روکنے کے لیے آگے بڑھتے تھے تو زخمی پنڈلی والا جواد علی خان کو ختم کر دیتا، لیکن دوسری طرف کئی زندگیاں خطرے میں تھیں اور یوں بھی وہ انوار علی خان کی حفاظت کے لیے آئے تھے، چنانچہ محمود پوری قوت سے چیخا:

"نہیں! تم لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ہوا میں ایک چھلانگ لگائی اور خنجر والے سے جا ٹکرایا۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا۔ اوندھے منہ گرا، فرزانہ نے جھپٹ کر خنجر اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اب اگر تم نے ان لوگوں کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو میں یہ خنجر تمہارے جسموں میں اتار دوں گی۔" وہ غرائی۔

حملہ آور دم بخود رہ گئے۔ اسی وقت انہوں نے ایک آواز سنی:

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

انہوں نے چونک کر دیکھا، دروازے میں انسپکٹر جمشید کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔

○

"یہ کیا دھینگا مشتی ہے؟" انہوں نے پھر کہا۔

"آپ ہی نے تو انوار علی صاحب کی حفاظت کے لیے ہمیں یہاں چھوڑا تھا۔ اب اگر ہم نے ان کی جان بچائی ہے تو آپ اسے دھینگا مشتی کہہ رہے ہیں؟" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ! لیکن ان لوگوں کو کیا ہوا، یہ بے ہوش کیوں پڑے ہیں اور یہ تین حضرات اندر کس طرح داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کو زخمی کس نے کیا۔ یہ تھوڑی ہی دیر میں یہاں کیا کچھ ہو گیا؟"

"میرا خیال ہے پہلے انہیں باندھ لیا جائے۔ پھر آپ کو تفصیل سے سنائیں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"تجویز معقول ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے پستول جیب سے نکال لیا اور محمود، فاروق اور فرزانہ نے انہیں باندھنے کا کام شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان تینوں کو باندھ چکے

تھے۔ پھر انسپکٹر جمشید کو بتایا گیا کہ کس طرح وہ تو شیفے کی تلاش میں نکلے اور ادھر ڈرائنگ روم کی طرف سے جواد علی خان بوکھلائے ہوئے آتے نظر آئے، انہوں نے آتے ہی بتایا کہ کمرے میں موجود سب لوگ بے ہوش ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں واپس بلا لیا جائے، چنانچہ محمود اور فاروق انہیں بلانے کے لیے باہر کی طرف دوڑے لیکن انہیں باہر دبوچ لیا گیا، اور یہ زخمی پنڈلی والا اندر داخل ہوا۔ یہ عین اس وقت اندر داخل ہوا تھا جب فرزانہ دروازہ بند کرنے گئی تھی، اس نے فرزانہ کی ناک پر ایک مکا رسید کیا اور اسے بے ہوش خیال کر کے اندر چلا گیا۔ ادھر فرزانہ بھی یہاں پہنچ گئی۔ یہ خنجر لیے انوار علی صاحب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جواد علی ایک طرف کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بس پھر فرزانہ اس سے الجھ گئی، ادھر اس کے دو ساتھی اور آ گئے، اس دوران فرزانہ اسے زخمی کر چکی تھی، فوراً بعد ہی محمود اور فاروق بھی اندر آ گئے، انہیں ہوش آ گیا تھا۔ اور اب حالات آپ کے سامنے ہیں۔"

"ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ لوگ بے ہوش کس طرح ہوئے۔ خیر پہلے تم جا کر ظہور کو کھولو، اور میں ان لوگوں کو ہوش میں لانے کی

کوشش کرتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انہوں نے بے ہوش افراد کو ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ آخر ڈاکٹر کو فون کرنا پڑا۔ طہور نے آکر بتایا کہ وہ اس کمرے سے کچھ لینے گیا تھا کہ پیچھے سے کسی نے سر پر کچھ دے مارا۔ اس کے بعد اُسے اب ہوش آیا تھا۔

"جواد علی صاحب! آپ بتائیے! آخر یہ لوگ کس طرح بے ہوش ہو گئے تھے؟"

"میں تو خود حیران ہوں۔ میں دو منٹ کے لیے لیٹرین تک گیا تھا۔ واپس آیا تو یہ سب گرے پڑے تھے، لیکن آپ کے تینوں بچے کمرے میں نہیں تھے۔ وہ آپ کے ساتھ پہلے ہی کمرے سے نکل چکے تھے، چنانچہ میں کمرے سے باہر بھاگا۔ یہ بیرونی دروازے کے پاس کھڑے نظر آئے اور میں نے انہیں اطلاع دی۔"

انسپکٹر جمشید نے یہ سن کر پورے کمرے کا جائزہ لیا پھر ان کی نظریں اس کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں جو گلی میں کھلتی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی اور اس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

"اس کھڑکی کے ذریعے کسی کا اندر آنا تو مشکل ہے، لیکن شاید کسی نے اندر کوئی ایسی چیز پھینکی ہو جس سے یہ بے ہوش

ہو گئے ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن ایسی کون سی چیز ہو سکتی ہے جس نے جواد علی صاحب یا ہم پر کوئی اثر نہیں کیا۔" فرزانہ نے سوچ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ کچھ سوئیاں بھی ہو سکتی ہیں، کلوروفارم کی سوئیاں، ایسی سوئیاں عام طور پر آپریشن کے مریضوں کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔"

"خیر! یہ تو ڈاکٹر صاحب ان کا معائنہ کرنے کے بعد بتا ہی دیں گے۔" محمود بولا۔

آخر خدا خدا کر کے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے ان کا معائنہ کیا۔ سب کو ایک ایک انجکشن دیا اور پھر بولے:

"آپ کا خیال ہے کہ ان کے جسموں میں سوئیوں کے ذریعے کلوروفارم داخل کیا گیا ہے۔ جب کہ میں ایسا نہیں سمجھتا، ان کے بے ہوش ہونے کی وجہ کچھ اور ہے، کیا ہے۔ یہ اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک ان کا تفصیلی جائزہ نہ لیا جائے، ان کا خون بھی ٹسٹ کرنا ہو گا۔"

"یہ بہت ضروری ہے ڈاکٹر صاحب جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہو جاتا کہ یہ بے ہوش کس طرح ہوئے ہیں، ہم اندھیرے میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔" انسپکٹر جمشید

بولے۔

"اور ٹھگ ڈبیاں تو روشنی میں بھی مارنکلے رہنا مناسب نہیں ہوتا"
فاروق بول پڑا۔ ڈاکٹر صاحب مسکرانے لگے۔

"یہ تم کہہ رہے ہو فاروق" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"تو اور کیا میرے فرشتے کہتے سنائی دے رہے ہیں تمہیں"
اس نے جل کر کہا اور ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ
ان تینوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ سرکاری ڈاکٹر ہونے کے ناطے
ان کی ملاقات ہوتی ہی رہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب خون لے کر چلے گئے۔ انہوں نے وعدہ کیا
تھا کہ آدھ گھنٹے تک فون پر اطلاع دیں گے۔ انسپکٹر جمشید
نے اکرام کو بھی فون کر دیا تھا۔ اسے رات کے وقت ہمیشہ دفتر
کے چپڑاسی کے ذریعے فون کیا جاتا تھا، کیونکہ دفتر کے کوارٹرز میں
ہی اس کی رہائش تھی۔

"کیا اب تم لوگ یہ بتانا پسند کرو گے کہ تمہارے نام کیا
ہیں، تم انور علی جج صاحب کو کیوں ہلاک کرنا چاہتے تھے"

"ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو سڑک پر سے گزر رہے تھے
کہ آپ لوگ پکڑ کر اندر لے آئے" زخمی پنڈلی والے
نے کہا۔

"بہت خوب! اور یہ تمہاری پنڈلی کس طرح زخمی ہو گئی"

انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ آپ لوگوں نے ہم پر ظلم توڑا ہے" اس نے کہا۔

"ہوں! بات تو ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے تم لوگ
کچھ بتانا پسند نہیں کرو گے، خیر، ہم معلوم کر لیں گے" انسپکٹر
جمشید بولے۔

تھوڑی دیر بعد اکرام اپنے ماتحتوں کو لے کر آ گیا۔ ان
تینوں کو ان کے حوالے کر دیا گیا، چند منٹ بعد ہی ڈاکٹر
کا فون آ گیا، اس نے کہا:
"ہیلو انسپکٹر صاحب! ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوئی
ہے"

"اور وہ کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب!"

"یہ کہ بے ہوشی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہو سکی"

"جی! کیا مطلب" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"مطلب یہ کہ خون میں کسی دوا کے اثرات نہیں ملے۔ نہ
کلوروفارم کے، نہ کسی زہر کے۔"

"تو پھر یہ لوگ بے ہوش کس طرح ہو گئے" انسپکٹر جمشید
حیران ہو کر بولے۔

"میں خود حیران ہوں، کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا" ڈاکٹر صاحب
نے جواب دیا۔

"یہ تو واقعی عجیب بات ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں! اب اس کا ایک ہی طریقہ ہے، یہ کہ ان لوگوں کو باقاعدہ چیک کیا جائے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"اور اس کے لیے ان لوگوں کو ہسپتال لانا پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"نہیں! اگر آپ چاہیں تو یہ کام یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ دو اسسٹنٹوں کو ساتھ لانا ہو گا۔"

"تو پھر لے آیئے ڈاکٹر صاحب، یہ معلوم کرنا انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ یہ کس طرح بے ہوش ہوئے۔" انہوں نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ میں آ رہا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا اور سلسلہ بند ہو گیا۔

انسپکٹر جمشید گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ کمرے میں موجود سب لوگ بے ہوش ہو گئے تھے۔ اگر کوئی بے ہوش ہونے سے محفوظ رہا تھا تو جواد علی خان، وہ بھی اس لیے کہ وہ چند منٹ کے لیے باتھ روم میں چلے گئے تھے۔

"کیا بات ہے ابا جان! آپ ڈاکٹر صاحب کا فون سن کر پریشان کیوں ہو گئے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"انہوں نے بات ہی ایسی بتائی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے ہونے والی گفتگو دہرا دی۔

"اوہ!" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ اچانک محمود کو کوئی خیال آیا۔ اس نے ایک دم اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی آتا ہوں!" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"اسے کیا ہوا؟" فرزانہ کے منہ سے حیرت زدہ سے لہجے میں کہا۔

"اُسے جاسوسی ہو گئی ہے، کبھی کبھی اسے اسی طرح جاسوسی ہو جاتی ہے اور یہ اُٹھ کر باہر چلا جایا کرتا ہے۔" فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"ضرور کوئی خاص بات معلوم کر کے آئے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ یہ بات یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"اس کے چونکنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اُسے کوئی خاص بات یاد آ گئی ہو۔" انہوں نے جواب دیا۔

"عام باتیں تو ہمیں یاد آتی ہی نہیں۔"

اسی وقت محمود دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گیس ماسک تھا، ایک چھوٹا سا گیس ماسک جو زہریلی گیس وغیرہ سے بچنے کے لیے ناک پر چڑھا لیا جاتا ہے۔

اندھیرے کا تیر

"یہ کہاں سے اٹھا لائے؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"اس کھڑکی کے نیچے سے۔" محمود نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ پھر انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا: "بہت خوب محمود! تمہیں اس کا خیال کس طرح آیا؟"

"جی مجھے تو اس کا خیال بھولے سے بھی نہیں آیا تھا۔ میں تو کھڑکی کے نیچے قدموں کے نشانات وغیرہ دیکھنے کے خیال سے گیا تھا، کیونکہ جس کسی نے بھی ان لوگوں کو بے ہوش کیا ہے، اس کھڑکی کے ذریعے ہی کیا ہے۔"

"ہوں! یہ بات تو ہے۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

اسی وقت خان رحمان کے منہ سے ایک ہلکی سی آواز نکلی اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

"کیا مجھے نیند آ گئی تھی؟" خان رحمان نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"اگر تمہیں نیند آئی تھی تو پھر باقی لوگوں کو بھی نیند ہی آئی ہو گی۔" انہوں نے دوسروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے چونک کر کہا اور دوسروں کی طرف دیکھا، پھر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تمہیں کیا ہوا تھا رحمان، کس طرح بے ہوش ہوئے تھے۔"

"اوہ! تو ہم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ارے ہاں یاد آیا، میرا سر زور سے چکرایا تھا۔" خان رحمان کو یاد آیا۔

"اور تم یہ نہیں دیکھ سکے کہ ہوا کیا تھا، سر کیوں چکرایا تھا؟"

"نہیں! اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ سر چکرانے سے پہلے ناک میں ایک تیز بو گھس آئی تھی۔" انہوں نے بتایا۔

چند منٹ کے اندر اندر سب لوگ ہوش میں آ گئے۔ وہ لوگ بھی صرف یہی بتا سکے کہ انہوں نے ایک تیز بو محسوس کی تھی۔

"معاملہ الجھ گیا ہے۔ ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اگر یہ سارا کام شیطے یا اس کے ساتھیوں کا ہے تو اب وہ گرفتار ہو چکے ہیں، لیکن انہوں نے یہ اقرار نہیں کیا کہ جج صاحب کے

گھر کو ڈائنامیٹ سے انہوں نے اڑایا ہے۔ یہاں سے جن تین آدمیوں کو گرفتار کیا گیا ہے، لے دے کے ان سے شاید کچھ معلوم ہو جائے، کیونکہ وہ بہرحال یہاں سے گرفتار ہوئے ہیں۔ دوسری چیز یہ گیس ماسک ہے۔ اگر محمود نے احتیاط کی ہو گی تو شاید اس پر سے کسی کی انگلیوں کے نشانات مل جائیں گے۔"

"میں نے اُسے صرف ایک کنارے سے پکڑا تھا۔" محمود بولا۔

"ٹھیک ہے، ہم اس پر سے بھی انگلیوں کے نشانات اٹھوائیں گے..... جج صاحب میں آپ سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ جواب دینا پسند کریں گے۔"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔" انہوں نے تھکی تھکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نعیمے کے علاوہ کیا آپ نے کسی اور کی بھی رشوت یا سفارش ٹھکرائی تھی؟" انسپکٹر جمشید نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ یہ سوال کرتے وقت ان کی نظریں جج صاحب کا بڑے غور سے جائزہ لے رہی تھیں۔

"بہت سوں کی، لیکن بہت سے کیس ایسے بھی تھے جن کی رشوت اور سفارش قبول کرنے سے تو میں نے انکار کر دیا تھا، لیکن ان کیسوں کے ملزم رہا کر دیے تھے۔ کیونکہ شہادتوں کی رو سے وہ جرم ثابت ہی نہیں ہو سکے تھے۔ البتہ نعیمے کے دوستوں

کو سزائے موت سنائی تھی اور اس کے علاوہ انسپکٹر نعمانی کی سفارش بھی قبول نہیں کی تھی، وہ بھی قتل کا کیس تھا اور اسے عمر قید سزا دی گئی تھی۔"

"آپ نے کیا فرمایا، انسپکٹر نعمانی نے کسی ملزم کی سفارش کی تھی؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"ہاں! یہ حقیقت ہے۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن انسپکٹر نعمانی نے کیوں سفارش کی تھی، ملزم سے اس کا کیا تعلق تھا؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ میں نے اس سے نہیں پوچھا تھا، پوچھنے کی ضرورت بھی کیا تھی جب کہ مجھے فیصلہ بغیر کسی سفارش و رشوت کے دینا ہوتا ہے۔" جج انوار علی صاحب نے جواب دیا۔

"ہوں! تب تو اس سلسلے میں انسپکٹر نعمانی سے پھر ملنا پڑے گا۔" انہوں نے کہا اور فون پر اس کے نمبر گھمانے لگے، جلد ہی سلسلہ مل گیا۔

"ہیلو انسپکٹر نعمانی! میں جمشید بول رہا ہوں، آپ پولیس اسٹیشن میں ہی موجود ہیں نا، جی..... جی ہاں، میں آپ کے پاس آ رہا ہوں، میرا انتظار کیجئے گا، آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور ان تینوں کی طرف مڑے:

"تم اسی کمرے میں موجود رہو گے۔ ایک منٹ کے لیے بھی جج صاحب کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دو گے یہ سخت خطرے میں ہیں۔"

یہ کہتے ہی وہ کمرے سے نکل گئے اور وہ سب حیرت زدہ رہ گئے۔ ابھی انہیں گئے چند منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ دروازے کی گھنٹی بجی اور وہ چونک اٹھے۔

○

انسپکٹر نعمانی ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی بولا:

"خیریت تو ہے جناب! ایک ہی رات میں آپ دوسری مرتبہ آئے ہیں۔"

"ہاں! حالات ایسے ہی ہیں! کیا آپ نے کسی قتل کے ملزم کی جج انوار علی صاحب سے سفارش کی تھی۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے، جج صاحب نے آپ کو یہ بات بتادی ہے، جی ہاں! یہ سچ ہے۔" اس نے کہا۔

"بہت خوب! جس ملزم کی آپ نے سفارش کی تھی، اس کا کیا نام ہے۔ وہ کونسی جیل میں ہے، آپ نے اس کی سفارش کیوں کی تھی جب کہ آپ خود قانون کے محافظوں میں

شامل ہیں۔" وہ کہتے چلے گئے۔

"ملزم میرا سگا چچا زاد بھائی تھا۔ یہ جرم اس سے غصے کے عالم میں ہوا تھا، لیکن ساری شہادتیں اس کے خلاف تھیں، میری خواہش تھی، اسے نرم سزا ملے، اسی لیے میں جج صاحب کے پاس سفارش لے کر چلا گیا۔ ان کے ہاں میرا آنا جانا تھا، لیکن انہوں نے سفارش نہیں مانی اور میں مایوس ہو کر چلا آیا۔ دوسرے دن انہوں نے ملزم کو عمر قید کا فیصلہ سنا دیا۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر نعمانی خاموش ہو گیا۔

"آپ یہاں کتنے عرصے سے لگے ہوئے ہیں۔" انہوں نے پوچھا۔

"تقریباً چھ سال سے، اس سے پہلے میں کریم آباد میں تھا۔"

"ہوں! اس علاقے میں بھی آپ کی کارگزاری کا تمام ریکارڈ دیکھنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"بات کیا ہے جناب؟" اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس پہلو سے کیس کا جائزہ لے رہا ہوں، کہیں وہ آپ تو نہیں جنہوں نے انتقام لینے کے لیے جج صاحب کا مکان ڈائنا مائیٹ سے اڑانے کا پروگرام بنایا۔"

"ارے نہیں صاحب، بھلا میں ایسا کیوں کرتا۔ [illegible]

کر کہا۔

"پھر بھی میں ریکارڈ تو ضرور دیکھوں گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن کس قانون کے تحت؟" انسپکٹر نعمانی نے تنک کر کہا۔

"اگر آپ قانون کی بات درمیان میں لے آئے ہیں تو سنیے، میں اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لے چکا ہوں، ابھی تک یہ کیس کسی بھی محکمے کے پاس ہو، کسی کے بھی ہاتھ میں ہو، اس کی تفتیش میں اپنے ذمے لے سکتا ہوں اور جب میں کیس کا انچارج بن جاتا ہوں تو اس سلسلے میں جو بھی تفتیش کے دائرے میں آئے گا، اس سے پوچھ گچھ کروں گا، جج انوار علی نے باقاعدہ آپ کا نام لے کر یہ بیان دیا ہے کہ آپ نے بھی قتل کے ایک ملزم کی سفارش کی تھی، ان حالات میں میں چھان بین کیے بغیر نہیں رہوں گا۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جج صاحب کے کیس سے میرے ریکارڈ کا کیا تعلق۔" انسپکٹر نعمانی نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔

"یہ میں جانتا ہوں، کوئی تعلق کس طرح ہے، آپ یہ بتائیں، ریکارڈ دکھا رہے ہیں یا نہیں۔"

"جی نہیں، کیونکہ آپ ابھی تک ریکارڈ دیکھنے کا حق ثابت نہیں کر سکے۔" اس نے بھی اکڑتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب! اب میں حق ثابت کر کے دکھاؤں گا، ویسے کیا آپ بتا سکتے ہیں، آپ کا سفارش کرنا کس قانون کے تحت جائز تھا۔"

"مجھ سے غلطی ہوئی تھی اور پھر جج صاحب نے میری سفارش مانی کب تھی۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ایک فون کروں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"آپ میرے دفتر کا فون استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتے۔" انسپکٹر نعمانی نے غرا کر کہا۔

"اس سلسلے میں آپ قانونی کارروائی کر لیجیے گا۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے نمبر گھمانا بند نہ کیا، اسی وقت سلسلہ مل گیا۔ انہوں نے جلدی سے کہا:

"اعجاز، اقبال آباد میں فوری ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ انسپکٹر نعمانی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن پھر ہونٹ بند کر لیے اور بے بسی سے پولیس اسٹیشن کے گیٹ پر چوکیدار کو دیکھنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ آخر ایک جیپ کے تیز سائرن کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی، پھر خفیہ پولیس کے تین باوردی افسر اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے انسپکٹر جمشید کو ایک ساتھ سلوٹ کیا

اور پھر ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ایک کاغذ ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے قلم جیب سے نکالا اور کاغذ پر ایک جگہ انسپکٹر نعمانی کا نام اور عہدہ لکھ کر کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کاغذ دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ یہ تلاشی کے وارنٹ تھے اور خفیہ پولیس کے چیف آفیسر کی طرف سے تھے جس کی تعمیل سے انکار کی سزا فوری گرفتاری اور پھر عدالت میں پیشی تھی۔ انسپکٹر نعمانی کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انسپکٹر جمشید کو دیکھا اور پھر بولا:

"ٹھیک ہے، میں ریکارڈ دکھانے کے لیے تیار ہوں۔"

"اب بات صرف ریکارڈ دیکھنے تک ہی نہیں رہے گی۔ باقاعدہ تلاشی لی جائے گی۔ آپ تینوں تھانے کی ایک ایک چیز کی تلاشی لیں۔ عملے کو ایک خالی کمرے میں بٹھا دیں اور ریکارڈ لا کر مجھے دے دیں، انسپکٹر نعمانی یہیں رہیں گے، تاکہ یہ یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے اپنے پاس سے تھانے میں کچھ رکھ دیا ہے۔ انسپکٹر صاحب اگر چاہیں تو آپ سب کی اور میری تلاشی لے سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد تھانے اور ریکارڈ کی جانچ پڑتال شروع ہو چکی تھی اور انسپکٹر نعمانی بے بسی کے عالم میں بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ آخر تقریباً بیس منٹ بعد تینوں افسر واپس انسپکٹر

جمشید کے سامنے حاضر ہوئے اور انہوں نے کچھ چیزیں میز پر رکھ دیں۔

"یہ چیزیں غیر قانونی طور پر تھانے میں موجود ہیں۔ ان کا اندراج موجود نہیں۔"

انسپکٹر جمشید نے ان چیزوں کی طرف دیکھا، ان میں چند سنہری گھڑیاں، سونے کی انگوٹھیاں اور کچھ دوسرے زیورات تھے۔

"یہ چیزیں ضرور کسی چور کے پاس سے برآمد ہوئی ہوں گی اور انسپکٹر صاحب موقع دیکھ کر انہیں یہاں سے لے جانے کی فکر میں ہوں گے۔ اس کے علاوہ جس سال یہ اس تھانے میں آ کر لگے تھے، اس سال ایک عمارت سے انہیں ڈائنا مائیٹ بھی ملا تھا، وہ ڈائنا مائیٹ کیوں تھانے میں نہیں ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟" انسپکٹر جمشید نے ریکارڈ کے ایک صفحے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر نعمانی کا رنگ اڑ گیا، وہ تھر تھر کانپنے لگا پھر اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"خدا کی قسم، میں نے جج صاحب کی کوٹھی میں ڈائنا مائیٹ نہیں لگایا تھا۔" اس کے لہجے میں حد درجہ گھبراہٹ تھی۔

"میں نے یہ سوال کب پوچھا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"سوال یہ ہے کہ وہ ڈائنا مائیٹ کہاں ہے جو ریکارڈ کی رو سے

تھانے میں موجود ہے۔"

"جج صاحب کے گھر میں دھماکے کی خبر سن کر میں نے فوراً اس جگہ کا جائزہ لیا تھا جہاں ڈائنا مائیٹ رکھا تھا، لیکن مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"بہت خوب! تو کیا آپ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کی تھی، اپنے افسرانِ بالا کو اطلاع دی تھی، میں جب جج انوار علی کے سلسلے میں یہاں آیا تو کیا آپ نے مجھے یہ بات بتائی تھی، نہیں، لہٰذا صاف ثابت ہے کہ ڈائنا مائیٹ تھانے سے خود آپ نے چرایا اور جج صاحب کی کوٹھی میں سیٹ کر دیا اور جیسا اس وقت آپ بھی کوٹھی کے باہر کہیں چھپے ہوئے تھے۔ جب محمود، فاروق اور فرزانہ وہاں پہنچے، لیکن آپ نے انہیں نہیں دیکھا ورنہ شاید ان کے اندر داخل ہونے سے پہلے تاروں کے سرے ملا کر دھماکا کر دیتے۔ لیکن خدا کو تو جج صاحب کا بچنا منظور تھا۔ لہٰذا میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔ ڈائنا مائیٹ والا الزام اگر ثابت نہ بھی ہوا تو عدالت آپ سے یہ ضرور پوچھے گی پھر آخر ڈائنا مائیٹ کہاں گیا اور تھانے میں موجود چیزوں میں خرد برد بھی پائی گئی ہے۔ لہٰذا آپ کے بچ جانے کا کوئی امکان نہیں، آپ خود کو اس قانون کے

حوالے کر دیں جس کے آپ بھی بدقسمتی سے محافظ ہیں، لیکن جب محافظ ہی قانون توڑنے پر اتر آئیں تو پھر قانون بے چارہ کر ہی کیا سکتا ہے۔"

انسپکٹر جمشید کی آواز بھرا گئی۔ یہ بات ان کے لیے حد درجے تکلیف دہ تھی کہ کوئی سرکاری افسر خاص طور پر پولیس افسر گرفتار کیا جائے، لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ انسپکٹر نعمانی کے ہاتھوں ہتھکڑی ڈال دی گئی۔ اس کا سر یوں جھک گیا، جیسے اب کبھی اوپر نہ اٹھ سکے گا۔ انسپکٹر جمشید وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتے باہر آ گئے اور جیپ میں بیٹھ کر ایک بار پھر خان رحمان کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ آج کی رات بھی عجیب رات ہے، جانتے ہیں وہ جج انوار علی صاحب کے کیس کے سلسلے میں، نکل آتا ہے کوئی اور، چکر، شیفر اور بادشاہ گرفتار ہو گئے، لیکن یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ جج صاحب کا گھر ان کی کوشش سے اڑا تھا۔ وہ انسپکٹر نعمانی کو چیک کرنے نکلے، وہ بھی گرفتار ہو گیا، لیکن یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ ڈائنا مائیٹ والے کھیل میں اس کا ہاتھ ہے یا نہیں۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ تھانے میں کسی کیس میں پکڑا ہوا ڈائنا مائیٹ ضرور موجود تھا۔ جواب نہیں ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہ سوال اب

انسپکٹر نعمانی سے پوچھا جانا تھا۔ انسپکٹر نعمانی کو خان رحمان کے گھر آنے کی ہدایت وہ دے ہی چکے تھے۔ یہی نہیں، راستے میں ایک جگہ رک کر انہوں نے شیفے اور بادشاہ کو بھی وہیں سے آنے کی ہدایات دے ڈالیں۔ وہ ایک عجیب سی الجھن محسوس کر رہے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی شخص انہیں چکر دے رہا ہے، چال چل رہا ہے۔ تمام واقعات پر غور کرتے ہوئے وہ لمحہ بہ لمحہ خان رحمان کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ گھر کے اندر داخل ہوئے تو خفیہ پولیس والے شیفے اور بادشاہ کو وہاں لا چکے تھے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی شیفے سے کہا:

"انسپکٹر نعمانی کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس نے یہ اقرار کر لیا ہے کہ ڈائنامائیٹ اس سے تم لے گئے تھے۔"

"کیا! اس نے یہ بات آپ کو بتا دی ہے۔ افسوس! میں انسپکٹر کو اتنا کمزور آدمی نہیں سمجھتا تھا۔"

وہ سب یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئے، خود انسپکٹر جمشید کو بھی اس کی امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے ایک بات معلوم ہو جائے گی، انہوں نے تو اندھیرے میں تیر چلایا تھا، لیکن یہ تیر بالکل نشانے پر بیٹھا۔

اسی وقت انہیں کوئی خیال آیا، وہ ایک دم دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

"محمود، فاروق اور فرزانہ بوکھلا اٹھے۔

حیرت پہ حیرت

محمود، فاروق اور فرزانہ الجھن میں پڑ گئے کہ کیا کریں۔ اپنے والد کے پیچھے جائیں یا وہیں ٹھہریں۔ انسپکٹر جمشید کی انہیں یہ ہدایت بھی کہ جج صاحب کو ایک منٹ کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے، دوسرے یہ کہ دوڑتے وقت انہوں نے انہیں اپنے پیچھے آنے کے لیے بھی نہیں کہا تھا، لہٰذا فیصلہ یہی کیا گیا کہ وہیں ٹھہریں۔ ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ واپس آتے نظر آئے۔

"خیریت تو ہے ابا جان!" فرزانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں! فکر والی کوئی بات نہیں۔" یہ کہہ کر وہ سب سے مخاطب ہوئے۔

"میری درخواست ہے کہ سب لوگ بیٹھ جائیں، میں نے انسپکٹر نعمانی کو یہاں لانے کی ہدایات دے دی ہیں، وہ آ کر آپ سب لوگوں کے سامنے یہ تسلیم کریں گے کہ ان سے ڈائنا مائیٹ شیخو نے خرید لیا تھا اور وہ بھی بھاری معاوضہ

دے کر، کیوں کیا یہ غلط ہے؟"

"اب جب کہ انسپکٹر یہ بات تسلیم کر چکا ہے، میں انکار کر کے کیا کروں گا، ہاں۔ میں اقرار کرتا ہوں، ڈائنا مائیٹ میں نے ہی اس سے لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک ڈائنا مائیٹ اس تھانے میں موجود ہے۔" اس نے کہا۔

"اور تمہیں یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی تھی؟" انہوں نے پوچھا۔

"میرے ایک دوست کا جوئے کا اڈا تھا، وہاں اس نے پولیس کے چھاپے کے ڈر سے ڈائنا مائیٹ لگا رکھا تھا کہ اگر کبھی چھاپہ پڑا تو اڈے کو ہی اڑا دے گا۔ کسی طرح انسپکٹر نعمانی کو اس بات کا پتا چل گیا، اس نے چھاپہ ایسے وقت مارا جب میرا دوست گھر میں نہیں تھا، اس طرح اس نے ڈائنا مائیٹ پر قبضہ کر لیا اور میرے دوست کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس ڈائنا مائیٹ ہے، مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ انسپکٹر نعمانی رشوت خور قسم کا آدمی ہے۔ چنانچہ جیل سے رہا ہونے کے بعد مجھے جج صاحب سے انتقام لینے کی سوجھی تو میں سیدھا انسپکٹر کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو ڈائنا مائیٹ پانچ ہزار روپے کے بدلے میرے حوالے کر سکتا ہے، انسپکٹر نے بھی سوچا کہ ڈائنا مائیٹ تھانے

میں بے کار ہی تو پڑا ہے، چنانچہ اس نے یہ سودا منظور
کر لیا۔ میں بادشاہ کے پاس گیا۔ گرفتاری سے پہلے میں زیرو کلب
کا خاص آدمی تھا۔ بادشاہ کو ساری بات بتائی تو اس نے فوراً
پانچ ہزار روپے میرے حوالے کر دیے۔ میں گیا اور ڈائنا مائیٹ
خرید لایا۔ یہاں تک کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رکا ہی
تھا کہ انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

"اور پھر تم نے جج صاحب کو ایک خط لکھا کہ میں
تمہیں ہر حال میں ختم کر دوں گا، میں نے اپنی زندگی کا
مقصد یہی بنا لیا ہے۔"

"نہیں! میں نے انہیں کوئی خط نہیں لکھا، میں تو نہایت
خاموشی سے یہ کام کرنا چاہتا تھا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"تم نے خط نہیں لکھا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" انسپکٹر
جمشید کے منہ سے حیرت زدہ لہجے میں نکلا، محمود، فاروق
اور فرزانہ بھی اسے گھورنے لگے۔

"ہاں! یہ حقیقت ہے، میں نے جج صاحب کو کوئی خط
نہیں لکھا۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"خیر آگے کہو، پھر تم نے کیا کیا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔
ان کی حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اگر شیفے نے جج
صاحب کو وہ زرد لفافے والا خط نہیں لکھا تھا اور پھر

دروازے میں خنجر کے ساتھ زرد خط نہیں لگایا تھا تو پھر تو
پورا کیس ایک بار پھر گڑبڑ ہو گیا تھا۔ انہوں نے سنا،
شیفہ کہہ رہا تھا:

"ڈائنا مائیٹ لا کر میں نے کلب والے کمرے میں رکھ دیا
اور جج صاحب کے گھر کو اڑانے کا پروگرام بنانے لگا۔ دراصل
ڈائنا مائیٹ سے گھروں کو اڑانے کا مجھے خاص تجربہ ہے
اور کئی دوسرے لوگوں کو یہ بات معلوم بھی ہے۔ اس لیے
میں نے اس ذریعے سے کام نکالنے کا پروگرام بنایا تھا۔
اور رات کو تاریکی میں جج صاحب کے در و دیوار کا جائزہ
بھی لے آیا تھا۔ آج سے دو دن پہلے میں نے اپنے
منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کیا، کمرے کی الماری
کھولی اور ڈائنا مائیٹ نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن
یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ ڈائنا مائیٹ الماری میں
نہیں تھا۔"

"کیا کہا! الماری میں ڈائنا مائیٹ نہیں تھا؟" انسپکٹر جمشید
کے منہ سے نکلا، دوسرے بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ کیس
نے ایک اور بالکل نیا موڑ لیا تھا۔

"جی ہاں! میں ڈائنا مائیٹ کے بارے میں کسی سے
پوچھ بھی نہ سکا، صرف بادشاہ اور انسپکٹر نعمانی صاحب

سے ضرور اس کا ذکر کیا، لیکن یہ دونوں بھی حیرت کا اظہار
کرکے رہ گئے اور پھر دو دن بعد صبح کے اخبار میں میں نے
یہ پڑھی کر جج صاحب کے گھر کو ڈائنا مائیٹ کے ذریعے
ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
سب لوگ سوچ میں ڈوب گئے۔ آخر محمود نے کہا۔
"اس راز سے صرف دو آدمی واقف تھے کہ ڈائنا مائیٹ
تم نے انسپکٹر نعمانی سے خریدا ہے، خود نعمانی صاحب اور
دوسرے بادشاہ، تو پھر صاف ظاہر ہے، ڈائنا مائیٹ الماری
میں سے ان دونوں میں سے کسی ایک نے اڑایا ہو گا۔"
"لیکن میں اسے اڑا کر کیا کرتا، میں نے تو اسے فروخت کر
دیا تھا۔" انسپکٹر نعمانی نے جھلا کر کہا۔
"اور مجھے بھی بھلا کیا ضرورت تھی؟" بادشاہ بولا۔
"تو پھر کیا تم لوگوں میں سے کسی کے فرشتوں نے یہ حرکت
کی ہے۔" فاروق نے کہا۔
"کم از کم اس سے ایک بات تو ثابت ہے کہ جج صاحب
کے گھر کو جس ڈائنا مائیٹ سے اڑایا گیا، وہ وہی تھا جو
انسپکٹر نعمانی سے شیفے نے خریدا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔
"اب سوال یہ ہے کہ شیفے کی الماری سے وہ کس نے
چرایا۔ جس نے چرایا، اسی نے دھماکا کیا اور وہی اصل مجرم

ہے۔ اسی نے ان لوگوں کو بے ہوش کیا اور تین کرائے
کے قاتلوں کی مدد سے ان لوگوں کو ختم کرانا چاہا۔ ایک بات
شروع سے میرے ذہن میں کھلبلی مچا رہی ہے اور وہ یہ
کہ اگر کوئی شخص جج صاحب سے انتقام لینا چاہتا ہے
تو اس نے ان کے ساتھ ان کے بیوی بچوں کو کیوں ختم
کرنا چاہا، کیا وہ انتقام کی آگ میں اس قدر اندھا ہو گیا
ہے کہ اس نے بچوں پر بھی رحم نہ کیا یا اس کی کوئی اور
وجہ ہے۔"
"بھلا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے، اس کیس میں بنیادی وجہ تو
انتقام ہی ہے۔" خان رحمان بولے۔
"ہاں! بظاہر یہی نظر آتا ہے۔ اکرام! ہمارے پاس صرف
ایک ہی راستہ ہے، بادشاہ اور انسپکٹر نعمانی سے جیسے بھی
بن پڑے یہ معلوم کیا جائے کہ ان میں سے ڈائنا مائیٹ کس نے
چرایا تھا۔ جب تک یہ معلوم نہیں ہو گا، بات آگے
نہیں بڑھے گی، چنانچہ انہیں امتحان کے کمرے میں لے چلو۔
میں بھی دیکھ آتا ہوں۔"
امتحان کا کمرہ مجرموں کی زبانیں کھلوانے کے لیے بہترین
جگہ تھی۔ یہاں مختلف قسم کے آلات لگے ہوئے تھے جن
کے استعمال کے بعد سخت سے سخت آدمی بھی فر فر بولنے

لگتا تھا، اس کا نام سن کر بادشاہ اور انسپکٹر نعمانی کا
رنگ اڑ گیا۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شیفی جھوٹ بول رہا ہو اور
ڈائنا مائیٹ خود اسی نے لگایا ہو۔" انسپکٹر نعمانی چلا اٹھا۔

"حالات اور واقعات پکار پکار کر یہ کہہ رہے ہیں کہ
اس مقام پر شیفی جھوٹ نہیں بول رہا، کیونکہ جج صاحب کو
مجرم نے دو خط بھی لکھے ہیں جن کے بارے میں شیفی کو
کچھ معلوم نہیں۔ خط ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور یہ معلوم
کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس کے ہاتھ کے ہیں۔ آپ اپنے ہاتھ کی تحریر دینا
پسند کریں گے؟"

"جی ہاں! کیوں نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"وہ خط میں نے بھی نہیں لکھے، میں بھی اپنے ہاتھ کی
لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔" بادشاہ نے جلدی سے

"اور میں بھی تیار ہوں۔" انسپکٹر نعمانی نے کہا

"تم دونوں سے تحریر کے بارے میں نہیں، ڈائنا مائیٹ کے
بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔ خیر تم تینوں اپنے اپنے ہاتھ
کی تحریر دے ہی دو۔"

انہوں نے جلدی جلدی تحریریں لکھ دیں۔ انہیں مجرم کی

طرف سے موصول ہونے والے خط سے ملایا گیا۔ تینوں میں سے
کوئی سی تحریر ذرا بھی نہیں ملتی تھی۔

"میرا خیال ہے، ان لوگوں کو امتحان گاہ میں لے جانا ہی
پڑے گا، یوں یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔" تنگ آ کر انسپکٹر
جمشید نے کہا۔

اکرام اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کانسٹیبلوں کو اشارہ
کیا۔ تینوں ملزموں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہلے ہی پڑی ہوئی
تھیں۔ کانسٹیبلوں نے ان کی زنجیروں کو حرکت دی تو بادشاہ
کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے جلدی سے کہا:

"ٹھہریے جناب! میں بتاتا ہوں۔"

"بہت خوب! یہ ہوئی نا بات۔ میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا
ہوں کہ تم دونوں میں سے ضرور کوئی ایسا ہے جس نے ڈائنا مائیٹ
شیفی کی الماری سے چرایا اور چونکہ کلب کے کمرے میں بادشاہ کا
پہنچنا انتہائی آسان ہے، اس لیے وہ تم ہی ہو سکتے ہو، جس نے
ڈائنا مائیٹ چرایا ہو گا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے، شیفی کی الماری سے ڈائنا مائیٹ
میں نے ہی چرایا تھا۔" بادشاہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اس کے ان الفاظ نے چند لمحوں کے لیے سب کو حیرت
میں ڈال دیا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ آخر فاروق کی آواز
سنائی دی:

"یہ کہیں تو گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا ہے۔"

"بہت خوب! تو ڈائنا مائیٹ تم نے اڑایا تھا۔ اب یہ
بھی بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا، کیا تم خود جج صاحب کے
گھر کو اڑانا چاہتے تھے، یا کوئی اور مقصد تھا۔"

"مجھے ایک پیش کش موصول ہوئی تھی۔" بادشاہ نے عجیب
سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"مجھے ایک خط ملا تھا اور اس خط میں لکھا تھا کہ ایک ڈائنا مائیٹ
کی ضرورت ہے۔ اگر کہیں سے میں پیدا کر دوں تو دس ہزار روپے
کے بدلے خریدا جا سکتا ہے۔ اگر تم ڈائنا مائیٹ حاصل کر
لو تو ہوٹل خیابان کے کمرہ نمبر ایک سو انیس میں لے آنا۔
دس ہزار روپے ادا کر دیے جائیں گے۔ میں خط کو پڑھ کر
بہت حیران ہوا، لکھنے والے نے اپنا پتا نہیں لکھا تھا۔
پھر میرے ذہن میں بجلی سی کوندی، ابھی ایک دن پہلے ہی
تو شیفہ مجھ سے ڈائنا مائیٹ خریدنے کے لیے پانچ ہزار
روپے ادھار لے چکا تھا۔ بس میں نے سوچا، کیوں نہ شیفے

والا ڈائنا مائیٹ اڑا کر دس ہزار کمائے جائیں، یہ دس ہزار
روپے بالکل مفت میں ہاتھ آ رہے تھے، لہٰذا میں نے موقع
کو ضائع نہیں کیا۔ جب شیفہ باہر گیا ہوا تھا تو میں اس کے
کمرے میں گھس گیا اور ڈائنا مائیٹ نکال دیا۔"

"تم نے یہ اچھا نہیں کیا بادشاہ۔ اب میں تمہارے پانچ ہزار
تمہیں نہیں لوٹاؤں گا۔" شیفے نے برا سا منہ بنایا۔

"چپ رہو، تم اس وقت واپس کرو گے جب جیل سے
رہا ہو گے۔" بادشاہ غرایا۔

"خیر دیکھا جائے گا۔" شیفہ بولا۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا؟" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"میں ہوٹل خیابان کے کمرہ نمبر ایک سو انیس میں پہنچا
تو وہاں میز پر مجھے ایک رقعہ پڑا ملا، لکھا تھا، وہ چیز میز کی
دراز میں رکھ دو، اپنی چیز دراز میں سے نکال لو اور چپ چاپ
واپس چلے جاؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ دراز میں نوٹوں کا پیکٹ
موجود تھا، میں نے پیکٹ لیا، ڈائنا مائیٹ دراز میں رکھا
اور باہر نکل آیا۔" بادشاہ نے کہا۔

"اور تم نے یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ
ڈائنا مائیٹ کون اٹھاتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"مجھے ضرورت بھی کیا تھی، دس ہزار مجھے مل گئے

تھے۔" اس نے کہا۔

"خیر! اس کا مطلب ہے، معاملہ ایک بار پھر الجھ گیا ہے۔ اچھا بادشاہ، تمہارے پاس اس کا وہ خط تو موجود ہو گا جو اس نے تمہیں لکھا تھا اور وہ رقعہ بھی جو ہوٹل کی میز پر ملا تھا۔"

"وہ رقعہ تو میں نے وہیں مسل کر پھینک دیا تھا۔ البتہ خط شاید کلب والے دفتر میں موجود ہو گا۔"

"بہت خوب! آپ لوگ اِسے لے کر زیرو کلب کے اوپر والے کمرے میں چلے جائیں اور خط برآمد کر لائیں۔ ذرا خیال رہے، یہ کوئی چالاکی نہ کھیل جائے۔" انسپکٹر جمشید نے خفیہ پولیس والوں سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔" ان میں سے ایک نے کہا اور پھر تینوں اسے لے کر چلے گئے۔ اسی وقت اکرام اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔

"اس میں وہ گیس ماسک ہو گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی ہاں! اس پر سے انگلیوں کے نشانات ملے ہیں، لیکن یہ نشانات....." اکرام کہتے کہتے رُک گیا۔

"خیر تو ہے، تم رُک کیوں گئے؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"نشانات جج انوار علی صاحب کے ہیں۔"

"کیا!!!" وہ سب ایک ساتھ چلائے۔

ان کے منہ حیرت اور خوف سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ خود جج صاحب کا مارے خوف اور حیرت کے بُرا حال تھا۔

بات کا وزن

ان کے دماغ بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ یہ ایک عجیب ترین بات معلوم ہوئی تھی۔ جج انوار علی صاحب کے گھر کو ڈائنا مائیٹ سے اڑایا گیا تھا، محمود، فاروق اور فرزانہ اگر عین وقت پر ان سب کو باہر نہ نکال لاتے تو وہ مکان کے نیچے ہی دب گئے تھے۔ ظاہر ہے، اس معاملے میں جج صاحب کا ہاتھ کسی صورت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بھلا وہ اپنے گھر کو بیوی بچوں سمیت ڈائنا مائیٹ سے کیوں اڑانے لگے، لیکن دوسری طرف اس گیس ماسک پر ان کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے جو خان رحمان کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے باہر محمود کو پڑا ملا تھا۔ کمرے میں موجود لوگوں کو کسی زہریلی گیس کے ذریعے بے ہوش کیا گیا تھا۔ اور اس گیس کو استعمال کرنے والے نے گیس ماسک اپنی ناک پر چڑھایا تھا۔ تو پھر کیا جج صاحب نے ان سب کو خود ہی بے ہوش کیا تھا، لیکن اس سے ان کا مقصد

کیا تھا۔ اگر کسی دوسرے نے یہ کام کیا تھا تو اس سے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کمرے میں موجود لوگوں کو اس لیے بے ہوش کیا تھا کہ آسانی سے جج صاحب کو ٹھکانے لگایا جا سکے، لیکن اب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خود جج صاحب نے ہی سب کو بے ہوش کیا تھا اور یہ بات کسی طرح بھی حلق سے نہیں اترتی تھی۔

"عجیب بات ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے اور پھر جج صاحب کی طرف مڑے۔

"آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔"

"یہی کہ میں نہیں جانتا، گیس ماسک پر میری انگلیوں کے نشانات کس طرح آئے۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا تھا اور میں انہیں بالکل بے ہوش ملا تھا، اگر میں جان بوجھ کر بے ہوش ہو گیا ہوتا تو ڈاکٹر ضرور یہ بات جان لیتے۔" انہوں نے کہا۔

"ہوں! بات یہ بھی ٹھیک ہے۔ ویسے میری سمجھ میں ایک بات اب تک نہیں آئی، کمرے میں موجود لوگوں کو جس کسی نے بھی بے ہوش کیا، انہوں نے جواد علی خان کو کیوں بے ہوش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، یہ مانا کہ جواد علی خان باتھ روم میں چلے گئے تھے، لیکن یہ کسی وقت

بھی آ سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ سب بے ہوش ہونے کے
بعد بھی تین حملہ آور اندر داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے
بھی ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"اس کی وجہ میں بتاتا ہوں۔" محمود نے کہا۔" ہوا دراصل
یہ ہے کہ بے ہوش کرنے والا آدمی کھڑکی کے باہر موجود تھا،
وہاں کھڑے ہو کر اس نے گیس ماسک ناک پر چڑھایا اور
گیس اندر چھوڑ دی، لیکن اس وقت جواد علی خان کمرے
میں نہیں تھے۔ جب یہ کمرے میں داخل ہوئے تو سب
بے ہوش پڑے تھے، البتہ ہم کمرے میں نہیں تھے۔ یہ
ہمیں بلانے کے لیے دوڑے، ہم ان کے ساتھ کمرے میں
آئے اور پھر میں اور فاروق آپ کو بلانے کے لیے نکل
گئے۔ ہمیں باہر دبوچ لیا گیا، فرزانہ نے دروازہ بند کرنا
چاہا تو اس کی ناک پر مکا لگا۔ اس طرح وہ تین حملہ آور
ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، انہیں دیکھ کر جواد علی خان تھر تھر
کانپنے لگے۔ انہیں تھر تھر کانپتے دیکھ کر انہوں نے ان کی
طرف کوئی توجہ نہیں دی۔"

"ہوں۔ فاروق، فرزانہ! تم دونوں کا محمود کے اس اندازے
کے بارے میں کیا خیال ہے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔
"اندازہ کافی وزنی معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی ہلکا پن
نظر نہیں آتا۔" فرزانہ نے کہا۔
"معلوم ہوتا ہے، آج کل چیزوں کے وزن کرتی رہتی ہو۔"
فاروق نے شریر لہجے میں کہا۔
"ہاں! لیکن تمہاری باتوں کا وزن آج تک نہیں کر سکی۔"
فرزانہ نے جل کر کہا۔
"کر بھی کیسے سکتی ہو، یہ تمہارے بس میں کہاں؟"
"فاروق! اس وقت ہم سنجیدہ ترین صورت حال سے دوچار
ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کڑے لہجے میں کہا۔
"اوہ جی ہاں! میں بھول گیا تھا۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔
بوکھلانے کی ایکٹنگ اتنی زور دار تھی کہ وہ مسکرائے بغیر
نہ رہ سکے۔

"ہاں تو محمود کی باتوں میں وزن میں بھی محسوس کر رہا
ہوں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کیس کی چابیاں دراصل
وہ تین حملہ آور ہیں۔ ان کی زبانیں کھلوائے بغیر ہم اس کیس کی
تہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

تینوں حملہ آوروں کو باندھ کر ایک کمرے میں ڈال دیا گیا
تھا۔ اب انہیں وہاں سے نکال کر ڈرائنگ روم میں لایا
گیا۔ لمبے آدمی کے اوورکوٹ کے کالر بھی گرا دیے گئے
تھے۔ جونہی ان تینوں کے چہروں پر جج انوار علی صاحب کی

نظر پڑی، ان کا منہ خوف سے کھلا کا کھلا رہ گیا، پھر انہوں
نے چیخنے کے انداز میں کہا:
"نہیں نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔"

○

ایک بار پھر ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جج صاحب کے
جملے کا مطلب اگرچہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا، لیکن
اس کے باوجود انہیں جملہ سن کر حیرت ہوئی تھی، خدا جانے
وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔
"کیس نے ایک اور کروٹ لی ہے، نہ جانے یہ ابھی
اور کتنی کروٹیں لے گا اور آخری کروٹ کونسی ہو گی، بلکہ کوئی
آخری کروٹ ہو گی بھی یا نہیں۔" فاروق کہتا چلا گیا۔
"کروٹ کی گردان کرنا کوئی تم سے سیکھے۔" فرزانہ بولی
"جج صاحب! جلدی کہیے، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"
انسپکٹر جمشید نے ان دونوں کی طرف توجہ دیے بغیر کہا۔
"نہیں نہیں! میں کچھ نہیں کہوں گا۔" انہوں نے کہا
"معلوم ہوتا ہے آپ کو کوئی خاص بات معلوم ہو گئی
ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ کو وہ بات بتا دینی چاہیے، اس
طرح آپ قانون کی مدد کریں گے۔ آپ تو خود جج ہیں۔ سوچ

ہی سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے:
"آپ اسی کیس پر کام کر رہے ہیں۔ مجرم کو گرفتار کرنا آپ
کا کام ہے۔ ہو سکتا ہے۔ میرا اندازہ غلط ہو اور میرے بیان
پر غلط آدمی پکڑا جائے، لہٰذا میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔"
جج صاحب نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"عجیب بات ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔ پھر تینوں
حملہ آوروں کی طرف مڑے:
"تم لوگوں کے نام کیا ہیں، کون ہو، کہاں رہتے ہو، تمہیں
جج صاحب سے کیا دشمنی ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔
"ہم کچھ نہیں جانتے، ہم کچھ نہیں بتائیں گے؟" لمبا آدمی بولا۔
"اکرام! کیا ان تینوں میں سے کسی کو پہچانتے ہو؟"
"جی نہیں! میں نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔" وہ بولا۔
"خیر! اب ایک سوال جواد علی خاں سے بھی کرنا چاہتا
ہوں۔ جواد صاحب آپ کیا کام کرتے ہیں؟"
"میں ایک کارخانے کا مالک ہوں۔" اس نے کہا۔
"یہ کارخانہ کس چیز کا ہے؟" انہوں نے پوچھا
"یہاں مختلف ادویات تیار ہوتی ہیں۔" اس نے بتایا۔
"بہت خوب! اب آپ ایسا کریں کہ آپ کی جیبوں میں
جو کچھ ہے، وہ نکال کر میز پر رکھ دیں۔" انسپکٹر جمشید

نے عجیب بات کہی۔

"جی! کیا مطلب؟" جواد علی کے منہ سے حیرت زدہ لہجے میں نکلا۔

"آپ کی جیبوں میں جو کچھ ہے، وہ نکال کر سب کے سامنے رکھ دیں۔" اس بار انسپکٹر جمشید کا لہجہ بہت سرد تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ چوکنا ہو گئے۔ بہت جلد کوئی زبردست راز کھلنے والا تھا، کیوں کہ اسی لہجے میں انسپکٹر جمشید اسی وقت بات کرتے تھے۔

"لیکن میں ایسا کیوں کروں؟" جواد علی خان نے جھنجلا کر کہا۔

"کیا آپ کی جیب میں کوئی ایسی چیز ہے جو آپ دوسروں کو دکھانا پسند نہیں کرتے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی چیز نہیں۔" اس نے کہا۔

"تو پھر سب چیزیں نکال کر دکھا دینے میں کیا حرج ہے۔"

"ہاں! کوئی حرج نہیں۔" جواد علی نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا اور پھر جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے۔ ہاتھ باہر نکلے تو ان میں پرس، شناختی کارڈ، ایک سگریٹ لائٹر کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ انسپکٹر جمشید نے ایک نظر ان چیزوں پر ڈال دی اور پھر بولے:

"آپ کی کسی جیب میں کچھ رہ تو نہیں گیا؟"

"نہیں، آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن میں ابھی تک نہیں سمجھا کہ آپ میری تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟" اس نے کہا۔

"مجھے ایک شک ہوا تھا، بس اپنے شک کو دور کرنا چاہتا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو پھر کیا آپ کا شک دور ہو گیا؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی دور نہیں ہوا۔ میں آپ کی جیبوں کو ٹٹول کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے؟" اس نے بھنا کر کہا۔

"ہاں! میرے خیال میں آپ نے جرم کیا ہے۔"

انسپکٹر جمشید کے ان الفاظ نے ڈرائنگ روم میں ایک دم سنسنی کی لہر دوڑا دی، پھر وہ تیزی سے جج انوار علی خان کی طرف مڑے:

"جج صاحب! اب آپ یہ بتا ہی دیں کہ تینوں حملہ آوروں کو دیکھ کر آپ چونکے کیوں تھے، آپ انہیں کس طرح جانتے ہیں، یہ کون ہیں؟"

"اوہ! تو آپ نے یہ بات محسوس کر لی کہ میں انہیں جانتا ہوں۔"

"جی ہاں! کیا اب آپ بتانا پسند کریں گے؟"

"ہاں! میرا خیال ہے، آپ بہت کچھ اندازہ لگا چکے ہیں
خیر میں بتاتا ہوں - یہ تینوں جواد علی کی فیکٹری میں کام
کرتے ہیں:"

"کیا!!!"

ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

منصوبہ کیا تھا

چند لمحے تک وہ سب حیرت کے بت بنے بیٹھے
رہے - پھر فرزانہ کے منہ سے کپکپائی آواز میں نکلا:

"اف خدا! تو کیا یہ سب چکر مسٹر جواد علی کا چلایا ہوا
ہے؟"

"ہاں انہوں نے ہی بادشاہ کے ذریعے ڈائنا میٹ خریدا،
اور پھر اسے لگا بھی دیا، لیکن بے احتیاطی یہ کی کہ تار نہ
چھپائے، یہ تار کچھ فاصلے پر ایک جھاڑی تک چلے گئے تھے
اور اس جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر تاروں کے سروں کو
ملانے کی دیر تھی کہ کوٹھی اڑ جاتی، لیکن فاروق کو تار نظر آ
گیا - اس طرح جج صاحب اور ان کے گھر والے تو بچ گئے،
لیکن کوٹھی ملبے کا ڈھیر بن گئی - ان کی فیکٹری میں کام کرنے والے
ان کا پوری طرح ساتھ دے رہے تھے، انہیں کے ذریعے انہوں
نے ڈائنا میٹ لگوایا تھا - ان کے آدمیوں نے انہیں اطلاع دی
کہ جج صاحب بچ گئے ہیں، یہ جان بوجھ کر دیر سے روانہ

ہوئے تاکہ یہ خیال کیا جائے کہ انہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں۔

اس کیس نے قدم قدم پر پریشان کیا، لیکن اب جب کہ یہ رُخ نظر آیا ہے تو تمام واقعات کی کڑیاں خود بخود ملتی چلی جا رہی ہیں۔ سب کے ساتھ جواد علی بھی یہاں آ گئے اور پوری طرح تیاری کر کے آئے۔ پروگرام یہ تھا کہ اگر وہ ٹنا ایسٹ والا وار خالی گیا ہے تو کیا ہوا، انہیں یہاں ختم کر دیا جائے گا۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی فیکٹری کے تین وفادار ترین آدمیوں کو چنا، انہیں پورا پروگرام بتایا، یہ میں اندازے لگا رہا ہوں، کیونکہ واقعات انہی اندازوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اپنی ادویات کی فیکٹری سے ایک ایسی گیس لی جس سے یہ وقتی طور پر بے ہوش ہو جائیں، لیکن بے ہوشی کی وجہ معلوم نہ ہو سکے۔ اس دوران ان کے ---------- وفادار اندر آ جائیں اور جج صاحب اور ان کے بیوی بچوں کا کام تمام کر جائیں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ جب مجھے دروازے تک رخصت کرنے گئے تو یہ لیٹرین تک جانے کا بہانہ کر کے کمرے سے نکل گئے اور ناک پر گیس ماسک چڑھا کر گیس کی شیشی کھول کر گیس کا رُخ اندر کی طرف کر دیا... میں اس شیشی کے لیے ان کی جیبوں کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ شاید یہ پہلے ہی فلش میں بہا چکے ہیں، اس لیے ان

کی جیب سے نہیں نکلی۔"

"لیکن ابا جان! گیس ماسک پر جج صاحب کی انگلیوں کے نشانات کس طرح آ گئے؟" اس موقع پر فرزانہ بول پڑی۔

"تم اتنی سی بات نہیں سمجھیں، بھئی بے ہوش آدمی کی انگلیوں کے نشانات تو کسی بھی چیز پر لیے جا سکتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"ہاں! بالکل ٹھیک، لیٹرین میں شیشی پھینک کر یہ واپس کمرے میں آئے، گیس ماسک پر جج صاحب کی انگلیوں کے نشانات لگائے اور اُسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا، تاکہ پولیس کو یہ ملے بھی تو اُلٹا جج صاحب پر ہی شک کیا جائے کہ شاید انہوں نے پہلے اپنے بیوی بچوں کو ختم کیا اور پھر خود کو ختم کر لیا۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید ذرا دیر کے لیے رُکے تو محمود بول پڑا:

"لیکن ابا جان! انہوں نے ہم تینوں کو بے ہوش کرنا کیوں ضروری نہیں سمجھا؟"

"اچھا سوال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ چاہتے تھے، کوئی ان کی بے گناہی کا ثبوت دینے والا بھی ہو، کوئی یہ کہہ سکے کہ جواد علی تو تمام وقت کھڑے تھر تھر کانپتے

رہے تھے لہٰذا حملہ آور ضرور کچھ ایسے لوگ تھے جنہوں نے
جج صاحب کو رشوت دے کر یا سفارش کرا کر اپنے کچھ
مجرموں کو بچانا چاہا ہو گا اور جج صاحب نے انکار کر دیا
ہو گا۔ اسی لیے انھوں نے یہ سارا ان کو قتل کرنے کا پروگرام
بنایا جب شیفر جیل سے رہا ہو کر آ گیا۔ شیفر کے بارے
میں انہیں سب کچھ معلوم ہو گا۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر
جمشید خاموش ہو گئے۔ سب سوچ میں گم ہو گئے۔ یوں
لگتا تھا جیسے کہانی نامکمل رہ گئی ہو۔ آخر فرزانہ نے کہا۔
"معلوم ہوتا ہے، کہانی کا کچھ حصہ آپ بچا گئے ہیں۔"
"ہوں! میرا بھی یہی خیال ہے۔" وہ مسکرائے۔
"تو پھر بتائیے نا، اور کیا بات رہ گئی ہے۔"
"تم ہی بتاؤ..... میں تو اتنا کچھ بتا چکا ہوں۔" وہ بولے۔
"میں بتاتا ہوں۔" محمود نے بے تاب ہو کر کہا۔ "ابھی تک
یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ جواد علی ایسا کیوں کرنا چاہتے
تھے، انہیں اپنے بھائی سے کیا دشمنی تھی۔"
"اوہ ہاں! واقعی، اس بات کے بغیر تو کہانی بالکل نامکمل
ہے۔" فاروق نے چونک کر کہا۔ دوسرے بھی اسی طرح سیدھے
ہو کر بیٹھ گئے۔ ابھی تک نیند کے عالم میں رہے ہوں۔
"اور یہی ایک ایسی بات ہے، جسے میں اب تک نہیں

سمجھ سکا، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، جج صاحب
رشوت سے کوسوں دور بھاگتے ہیں، لہٰذا ان کے پاس اتنی
دولت تو ہو نہیں سکتی کہ اس دولت کے لالچ میں یہ ایسا قدم
اٹھاتے، نہ ہی جج صاحب کی کوئی جائیداد ہے، پھر آخر
جواد علی کیوں ایسا کرنا چاہتے تھے، کیا آپ خود بتانا پسند
کریں گے جواد صاحب؟"
اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ یہ دیکھ کر جج صاحب
بولے:
"اس کی وجہ میں بتا سکتا ہوں، اب میں سمجھ گیا ہوں۔
یہ تو مجھے نہ جانے کب سے ختم کر دینے کے خواب دیکھ
رہے تھے، نہ صرف مجھے بلکہ میرے بیوی بچوں کو بھی، کیونکہ
انہیں ختم کیے بغیر ان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ آج سے
ایک سال پہلے یہ میرے پاس آئے تھے اور مجھے زندگی کا
بیمہ کرانے پر مجبور کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بیسیوں مجرموں
کے رشتے دار میرے جانی دشمن ہیں، کہیں کوئی ایسی ویسی بات
نہ ہو جائے، ہو گئی تو بیوی اور بچوں کا کیا بنے گا، اگر
میں زندگی کا بیمہ کرا لوں تو ایسی صورت میں انہیں ایک بڑی
رقم مل جائے گی۔ بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے پانچ
لاکھ روپے میں بیمہ کرا لیا..... اب اگر ہم سب مر جاتے

توپیے کی رقم ظاہر ہے انہی کو ملتی ۔ ضرور ان کے
ذہن میں یہی بات تھی ۔" جج صاحب یہ کہہ کر خاموش
ہو گئے۔

"کیوں جناب ! کیا یہی بات ہے ۔" انسپکٹر جمشید نے
پوچھا لیکن جواد علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم لوگ بتاؤ، ورنہ عدالت میں تم تینوں کو بھی برابر
کی سزا ملے گی ، مدد کرنے کی صورت میں عدالت سے
نرم سزا کی درخواست کی جائے گی ۔" انسپکٹر جمشید نے ان
تینوں سے کہا۔ آخر ان میں سے ایک بولا :

"کارخانہ روز بروز نقصان میں جا رہا ہے ، اگر اس میں
جلد مزید سرمایہ نہ لگایا گیا تو بالکل ختم ہو کر رہ جائے گا۔ یہ
صورت حال تقریباً ایک سال سے ہے۔ جواد علی یہ چاہتے
تھے کہ کسی طرح پانچ لاکھ روپے حاصل کر لیں ، چنانچہ انہوں
نے یہ منصوبہ بنایا ، ہم ان کے ملازم ہیں ، ان کا نمک کھایا
ہے ، لہٰذا ان کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی ۔"

"لیکن اس کام کے لیے انہوں نے تم تینوں کو ہی کیوں
چنا ؟" فرزانہ نے پوچھا ۔

"اس لیے کہ تینوں غنڈہ ٹائپ لوگ ہیں ، فیکٹری میں بھی
یہ ہمارے ذریعے ملازموں پر رعب جھاڑنے کا کام لیتے رہتے

ہیں ۔" اس نے بتایا ۔ "میرے ہاتھ سے ہی انہوں نے دو
دھمکی آمیز خط لکھوائے تاکہ یہ ظاہر ہو ، کسی مجرم کا رشتے دار
انتقام لینے پر اتر آیا ہے ۔"

"بہت خوب ! اب ساری بات صاف ہو گئی ۔ آخر یہ کیس
کس کروٹ بیٹھ ہی گیا ، جب کہ میرا خیال تھا ، اس کیس
کی کوئی کروٹ سرے سے ہے ہی نہیں ، کیونکہ یہ کیس ہے ،
کوئی اونٹ تو نہیں جس کی کوئی کل ہی نہیں ہوتی ۔" فاروق
نے شریر لہجے میں کہا۔

"کیا کہا ، اونٹ کی کوئی کل نہیں ہوتی ۔" محمود نے حیران
ہو کر کہا۔

"ہاں جس کل کی میں بات کر رہا ہوں ، وہ واقعی نہیں
ہوتی ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کل تقریباً تین چار معنوں
میں استعمال ہوتا ہے ، اب اگر میں نے ان کے معنی بتانے
شروع کیے تو تم کھو گئے ، یہ اردو کا پیریڈ نہیں ہے ، یوں
تو یہ سکول بھی نہیں ہے ۔ یہ تو انکل خان رحمان کا ڈرائینگ
روم ہے ، خیر مجبوری ہے ، کل کے معنی بتا کر کیا کل کل کرنی ۔"

فاروق نے بڑا سا منہ بنا لیا ، دوسرے مسکرانے لگے ۔ اکرام
اور اس کے ساتھی ہتھکڑیاں لے کر مجرموں کی طرف بڑھنے لگے۔

سفید خون کا انعامی سوال

س: ریخ انوار ملی صفحہ ۱۱ پر کیوں چونکے تھے؟

صحیح جواب دے کر انعام بھی حاصل کریں اور اپنے نام بچے بھی شائع کرائیں۔ نام اور پتے کتابیں پرنٹیں ہیں جانے تک موصول ہونے والے صحیح جواب والوں کے شائع کیے جاتے ہیں جب کہ انعام صرف تین کو دیا جاتا ہے اور یہ قرعہ اندازی کے ذریعے ہوتا ہے۔

انعام پانچ پانچ ناولوں کے پیکٹوں کی صورت میں ہوگا۔ اپنی پسند کے ناولوں کے نام، انعام پہنچنے کے بعد ہمیں روانہ کریں۔ ناول صرف اشتیاق کے ہی منگائیں۔

نوٹ: بالکل الگ کاغذ پر جواب تحریر کریں، اس پر صرف اپنا نام اور پتا لکھیں۔ کاغذ کے ننھے منے پرزے استعمال نہ کریں، ورنہ مقابلے میں شریک نہیں ہوں گے۔

انعام صرف آپ کی طرف سے ناولوں کے نام آنے کے بعد روانہ کیا جائے گا۔

(ادارہ)

"تیسرا آدمی" کا انعامی سوال

جواب یہ تھا: جب انھوں نے اسے بغیر عینک کے خط پڑھتے دیکھا۔

قرعہ اندازی کے بعد جو تین نام انعام کے حق دار قرار پائے، وہ یہ ہیں۔ روحی افزا۔ 5/115 ہرن روڈ کرشن نگر۔ ۲۔ اکبر حسین مکان نمبر ۳۱/۵۴، لاہور آٹو انجینئرنگ سیٹلائیٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی ۳۔ غزالہ نسیم محمد شفیع اینڈ سنز اردو بازار بھکر۔

بقیہ صحیح جواب ان بچوں اور بڑوں کا موصول ہوا۔

اسمار نجیب لاہور، اریبہ شریف لاہور، احسان بھٹہ لاہور، محبوب النبی محمود کراچی، محمد رفیق پاکستانی لاہور، انیلا فاروق لاہور، عرفان جعفری کراچی، عمران عالم ڈار لاہور، ندیم محبوب لاہور، آصف زمان کراچی، عرفان شمیم سرگودھا، سمیع اللہ بٹ نارووال، فرخ محمود تاندلیانوالہ، سیما ناہید لاہور، حسن عسکری لاہور، محمد رضوان لاہور، بیگم بانو

بیگم جمشید سے سوال

آپ انسپکٹر جمشید سے سوال کر چکے، اب آپ بیگم جمشید سے سوال کیجیے۔ سب سے دلچسپ سوال پر پانچ ناولوں کا پیکٹ بطور تحفہ دیا جائے گا۔ پسند کے ناولوں کے نام انعام پڑھنے کے بعد روانہ کریں۔ آئندہ آنے والے ناول بھی منگا سکتے ہیں، لیکن ناول صرف **مکتبہ اشتیاق** کے ہونے چاہییں۔ سوال کسی بھی قسم کا ہو سکتا ہے، بھلا چٹ پٹا ہو، تاکہ جواب بھی چٹ پٹا لگے۔

نوٹ: سوال بالکل الگ ایک کاغذ پر لکھیں۔ اس پر اپنا نام اور پتا ضرور لکھیں۔ کاغذ کے چھوٹے پرزوں پر ہرگز سوال نہ ارسال کریں۔

(ادارہ)

مکتبہ اشتیاق سے، انسپکٹر کامران مرزا کا پہلا ناول

ہزار سال کا آدمی

- ایک ایسے آدمی کی کہانی جو ایک ہزار سال سے ایک قلعے میں بند تھا۔
- بے شک ایک ہزار سال بعد اسے کسی سے انتقام لینا تھا۔
- ہزار سال بعد اس کی آنکھ خود بخود کھلنے والی تھی اور اپنے تابوت سے نکل کر اسے آج کی دنیا اور انسانوں کا سامنا کرنا تھا۔
- اور جب یہ سامنا ہوا تو انسپکٹر کامران مرزا، آفتاب، آصف، فرحت اور منور علی خان بھی وہاں موجود تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ وہ آدمی میں بھی ہوں جن سے اسے انتقام لینا ہے۔
- آپ نے اتنی حیرت انگیز کہانیاں بہت کم پڑھی ہوں گی۔ شائع ہو گیا ہے۔

قیمت: پانچ روپے

مکتبہ اشتیاق ۲- شیخ سٹریٹ اسلام پورہ- لاہور

بہرحال خاص نمبر دیا نہیں جیسا کہ پبلسٹی کی گئی تھی۔
آپ سے ایک درخواست یہ بھی ہے کہ ہر طرح کے
تنقیدی خط بھی شائع کر دیا کریں۔ چاہے وہ ... گروپ
سے ملتے ہوں، کیونکہ یہی تو زندہ دلی ہوتی ہے اور ساتھ
ان کا منہ توڑنے کے لیے ہم جو موجود ہیں۔

کامران وحید۔

ج: خط شائع کر دیا گیا۔

مکرمی جناب اشتیاق احمد صاحب!
آپ کے ارسال کردہ ناول جیرال کا منصوبہ اور تیسرا آدمی
مجھے مل گئے ہیں۔ پڑھے تو بہت پسند آئے۔ اتنا اچھا خاص نمبر
پیش کرنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ میں نے آپ کے تمام
ناول پڑھ رکھے ہیں۔ تمام ناول ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔
عمر کی باتیں بھی بہت دلچسپ ناول تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے
قلم کو اور عزت دے اور آپ دن دوگنی رات چوگنی ترقی
کریں۔

ہما سلیم ستارہ اینڈ کمپنی فیکٹریاں ایریا۔ فیصل آباد

ج: شکریہ۔ خاص طور پر عمر بن کی باتیں کی پسندیدگی کے لیے!

آپ کے خطوط میرے نام

ڈیر جانی اشتیاق۔ آداب،
ہم آپ کو پہلی مرتبہ خط لکھ رہے ہیں، امید ہے کہ
جواب ضرور دیں گے۔ ہم نے آپ کے سارے ناول
پڑھے ہیں اور ہم کو سب ہی بہت پسند آئے ہیں۔
لیکن پچھلے چند ناولوں میں آپ کے ناولوں کا معیار کچھ گر
سا گیا ہے اور اس دفعہ کے ناولوں میں خاص نمبر تو بالکل
بور تھی مگر تیسرا آدمی اچھی تھی۔
خاص نمبر میں کامران مرزا اور ان کے ساتھیوں کو آپ نے
نے ایک طرح سے نیچا دکھایا ہے اور نہ جانے کیوں آفتاب
کے مقابلے میں فاروق کو بڑا ظاہر کیا ہے۔ آپ اس
ناول میں سسپنس قائم کرنے کے باوجود کوئی خاص دلچسپی
پیدا نہیں کر سکے۔ آپ کے ناولوں کا معیار شاید اس لیے
گر گیا ہے، کیونکہ اب آپ کو ناولوں کے ساتھ ساتھ
سوالات کے جوابات بھی لکھنے پڑتے ہیں۔

پیارے انکل اشتیاق احمد عرف ایم گمنام

اسلام علیکم۔ امید ہے خیریت سے ہوں گے یہ میرا تیسرا خط ہے۔ اس سے پہلے دو خط لکھے جن میں سے ایک خط کا جواب آپ نے دیا اور دوسرا گول کر گئے۔ آپ سے امید ہے کہ اس خط کا جواب ضرور دیں گے۔ آج ہی میں نے آپ کی کتابیں لاکر پڑھیں۔ واقعی لاجواب تھیں۔

آپ نے جیرال کا منصوبہ تین سو صفحات کا شائع کرنے کا اعلان کیا تھا مگر ۲۵۲ صفحات کا شائع کیا۔ اس طرح تو یقیناً آپ کو نقصان اٹھانا پڑا ہوگا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ قیمت صفحات کی مناسبت سے رکھتے۔ چاہے آپ کا ناول بیس روپے میں ملے ہم تو ضرور پڑھیں گے۔

ایک اور بات آپ سے پوچھنی ہے کہ آپ اپنے فرضی نام ایم گمنام سے کتابیں کیوں لکھتے ہیں۔ آخر کوئی وجہ ہو گی یا کسی دوست نے مشورہ دیا ہو گا۔ آپ وجہ بتائیے۔

اس بار جیرال کا منصوبہ کچھ زیادہ ہی زور دار تھا۔ آپ نے انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں کو بالکل بے بس کر دیا تھا مگر پھر بھی وہ کامیاب ہو گئے۔ میں تو شروع ہی سے ان کا قائل ہوں۔ میں نے اور بہت سی کتابیں پڑھیں اور اب میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ

اب انسپکٹر جمشید کے سامنے شرلاک ہومز کے کارنامے بھی کچھ نہیں رہے۔ اور میرا یہ دعویٰ غلط بھی نہیں ہے۔

انکل: ایک نئی اور سنسنی خیز خبر سنیئے کہ اب تک تو دوسرے مصنف آپ کے انداز میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے مگر اب ستارہ طاہر نے تو آپ کی کتاب "ماموں کا ہنگامہ" کی صاف نقالی کر کے اپنی کتاب "اصلی نقلی" کو لکھا ہے اور یہ قانوناً جرم ہے کہ کسی اور مصنف کی کہانی کی نقل کی جائے۔ میرے پاس ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے الفاظ نہیں۔ ہمارے ملک میں یہ بات عام ہے کہ اگر کوئی مشہور ہو جائے تو دوسرے حاسد ہو جاتے ہیں اور اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ خدا آپ کو ایسے حاسدوں سے بچائے اور آپ اسی طرح لکھتے رہیں۔ آمین۔

جیرال کا منصوبہ کے آخر میں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آپ ۱۸ جنوری کو کراچی کے بچوں سے ملاقات کر چکے ہیں۔ اگر آپ کراچی آ رہے تھے تو اعلان ہی کر دیتے، اس طرح اچانک آ کر چلے جانے سے ہمیں تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب

آئیں تو اطلاع دے کر آئیے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔

مشتاق احمد

ج: کراچی پھر آؤں گا اور اعلان کرکے آؤں گا۔ اس وقت اعلان کرنا شروع نہیں کیا تھا۔

پیارے انکل اشتیاق احمد!

ہم آپ کو ۲/۵۰ روپے کا ٹکٹ بھیج رہے ہیں ہمیں یوزی کی تصویر ارسال کر دیں۔ آپ کراچی کب آئیں گے؟ کاش آپ کراچی آئیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہمارے گھر ضرور آئیے گا۔

یوسف اور سارہ

ج: آپ نے اپنا پتا نہیں لکھا، تصویر کس طرح روانہ کریں۔ کراچی بھی عنقریب آؤں گا۔ بے فکر رہیں۔

جناب اشتیاق احمد!

السلام علیکم: میں آج پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ میرے گھر میں سب آپ کو پسند کرتے ہیں۔ اس ماہ کی خونی جھیل پڑھی۔ سینڈوچز اور سموسوں کا مزہ آ گیا۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ آپ سینڈوچز اور سموسوں سے بھی زیادہ

اچھی اور مزیدار کہانی لکھیں گے جب آپ وطن کے دشمنوں کے خلاف لکھتے ہیں تو ہمارا دل وطن کے دشمنوں کے خلاف غصے سے بھر جاتا ہے اور ان کے خلاف ہماری نفرت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم ان کو کچا چبا جائیں۔ اللہ آپ کو اور زیادہ اچھی کہانیاں لکھنے کی توفیق دے۔ آمین

نور الصباح افضال ۲۶ اسی بلاک ڈی یونٹ ۶ لطیف آباد
حیدر آباد سندھ۔ (پاکستان)

ج: تھوڑے سے سینڈوچز اور سموسے ادھر بھی روانہ کریں۔

ڈیئر اشتیاق انکل!

السلام علیکم! میرا یہ آپ کے نام تیسرا خط ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں آپ میرا خط نہ چھاپنے کی ہیٹ ٹرک پوری نہ کر دیں۔ اگر ایسا کوئی ارادہ ہے تو پلیز ملتوی کر دیں۔ کیونکہ آپ کو ایسی ہیٹ ٹرک کی کوئی مبارک باد نہیں دی جائے گی۔ البتہ "جیرال کا منصوبہ" جیسا خوبصورت ناول لکھنے پر مبارک باد وصول کیجیے۔

آپ کے ناول ہم سب بہن بھائی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ حتیٰ کہ امی اور ابو بھی آپ کے فین (FAN) ہیں۔

انکل آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کہاں اور کب
کر سکتا ہوں یہ بتا دیں۔ شکریہ
الہلال ۲۴ بی۔ 1۔ بلاک نمبر ۱۰ ٹاؤن شپ۔ لاہور
ج۔ مکتبہ اشتیاق کے دفتر، لیکن آنے سے ایک ہفتہ پہلے
اطلاع دے دیں۔

میرے پیارے بھائی!
اسلام علیکم! آپ نے اس بار بھی خط کا جواب نہیں دیا،
خیر یہ تو آپ کی مرضی۔ جیرال کا منصوبہ کا آپ نے تین
مہینے انتظار کرایا، لیکن اتنی عمدہ کتاب تھی کہ قلم لکھنے سے
رک نہ سکا، بھائی جان مجھے آپ کی نئی تصویر ملی ہے۔ بھئی
واہ کیا خوب تصویر تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ آپ بوڑھے ہوں
گے، کیونکہ آپ کے ناول کے پیچھے والی تصویر ۱۹۷۶ء
کی تھی۔ ہم نے سوچا کہ بال سفید ہوں گے۔ داڑھی آ
چکی ہو گی، لیکن آپ کی تصویر نے ہماری سوچوں کو الٹ
پلٹ کر دیا۔ آپ تو بہت ہی چالاک نکلے۔ جواب کا شدت
سے انتظار کروں گا۔

احسان بھٹہ احمد والا۔ خیبر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور
ج: بھئی اس میں چالاکی کی کونسی بات ہے؟

ڈیئر انکل اشتیاق!
سلام مسنون: جیرال کا منصوبہ اور تیسرا آدمی کا بہت انتظار
کیا اور آخر انتظار کی گھڑی ختم ہوئی اور ۱۷ تاریخ کی شام
کو مل ہی گئے۔ جتنی خوشی ہمیں اس وقت ہوئی، شاید قارون
کا خزانہ ملنے سے بھی نہ ہوتی۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا
تو ناول میں اس طرح ڈوب گئے جیسے کوئی آدمی سمندر میں
ڈوب جاتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا، لیکن میں تو واپس
آ گیا، کیونکہ ناول ختم ہو چکا تھا۔ یعنی سیدھی سادھی بات
یہی ہے کہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیرال کا منصوبہ بہت پسند آیا۔
تیسرا آدمی بھی آپ نے بہت خوبصورتی سے لکھا۔ واقعی داد دینے
کو جی چاہتا ہے۔ کیا آپ صرف سالانہ خریداروں کے خطوط
شائع کرتے ہیں اگر یہ بات ہے تو مجھے افسوس ہے انکل
کہ میں آپ کا سالانہ خریدار نہیں بن سکتا، کیوں کہ ہم اتنے
امیر نہیں کہ اکھٹے ۹۵ روپے ارسال کر سکیں۔ فقط خط کی
اشاعت کا منتظر۔

معین الدین مکان نمبر 68/A سمن آباد۔ فیصل آباد
ج۔ خطوط صرف سالانہ خریداروں کے شائع نہیں کیے جاتے،
یہ غلط ہے، ہر تعمیری خط شائع کیا جاتا ہے۔

پیارے ڈیئر انکل اشتیاق احمد

اسلام علیکم۔ ہم آپ کے ناول ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اور جب تک ناول ختم نہ کریں اپنی جگہ سے نہیں اٹھتے شاید آپ اپنے ناولوں میں کوئی ایسی گیس بھر دیتے ہیں جو کہ ہمارے دماغوں کو بالکل سن کر دیتی ہے۔ اب تک ہم آپ کے تقریباً ۶۰ (ساٹھ) کے قریب ناول پڑھ چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک آپ کے ناولوں کی حیثیت ایسی ہے جیسے ہمارے آگے کوئی مزیدار کھانا رکھ دیا گیا ہوں۔ اسی طرح آپ کے ناول کو بھی دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔

(اقبال فتح۔ نور محمد۔ کراچی)

ج: آپ کا خط پڑھ کر تو خود میرے منہ میں پانی آ گیا ہے۔

تصویر کا مسئلہ

اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ میرے دو بہت ہی مہربانوں نے میری تصویر کے بے شمار پرنٹ تیار کر لیے ہیں۔ لہذا اب آپ مکتبہ اشتیاق سے تصویر منگانے کی بجائے ان دونوں حضرات کو صرف ایک خط لکھ کر تصویر منگا سکتے ہیں۔ ان کے لیے کسی مزید ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہوگی۔

لہذا بہتی ندیا میں ہاتھ جلدی جلدی دھو لیں۔ ان دونوں مہربانوں کے پتے درج ذیل ہیں۔

۱۔ فاروق احمد ۴۶ بی بلاک ایچ نارتھ ناظم آباد کراچی۔

۲۔ محمد اسلم زبیری ۱۴۳ اے بلاک ایچ نارتھ ناظم آباد کراچی۔

آپ کا

اشتیاق احمد

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے

چوٹ پر چوٹ

مصنف: اشتیاق احمد

- سالگرہ پارٹی میں ایک عجیب آدمی داخل ہوا۔
- شدید گرمی کے موسم میں اس نے سر پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔
- فرزانہ نے اس کے لائے ہوئے تحفے کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔
- اور یہاں سے ایک حیرت انگیز کہانی شروع ہوتی ہے۔
- گینڈے اور فادر سے ملیے۔
- شتو اور ڈشو ایک بار پھر سامنے آ رہے ہیں۔ ان سے آپ تیسرا آدمی ناول میں ملے تھے۔
- نیلی ڈبیوں کا راز کیا تھا۔
- ایک ایسی کہانی جس میں واقعات کہیں بھی رکتے نہیں!

قیمت: پانچ روپے

جیرال کا منصوبہ؟

- ہم نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ اپنی کاپی بک کرا لیں۔ کہیں آپ ہاتھ نہ ملتے رہ جائیں۔
- اور یہی ہوا۔ جیرال کا منصوبہ صرف تین دن کے اندر ختم ہو گئی۔ اب ہمارے پاس آرڈر پر آرڈر آ رہے ہیں۔ لیکن ہم فوری طور پر تعمیل کرنے سے قاصر ہیں۔
- دوسرے ایڈیشن کی تیاری کر لی گئی ہے۔ عنقریب شائع ہو گا۔
- چنانچہ جب تک جیرال کا منصوبہ دوبارہ شائع نہیں ہو جاتا، آپ "تیسرا آدمی"، "سفید خول"، "چوٹ پر چوٹ" اور تیسرا آدمی پڑھیے۔

مکتبہ اشتیاق - ۲ شیخ سٹریٹ - اسلام پورہ - لاہور